تعویز حُب

ایمل رضا

ایمل رضا

آتشِ رُخ

السائی ہوئی دھوپ میں خوابیدہ انگڑائی کا خمار تھا۔ تاجدار سورج اپنی تمام تر تابانی سمیت نصف النہار کے زاویے سے آگے کی اور سرک چکا تھا۔ اور ہوا میں نووارد شام کی خنکی عود آئی تھی۔

خزاں آلود اشوک کے درخت اپنے باقی ماندہ اثاثے بھی اسی ناراض ہوا کے سپرد کرنے لگے تھے۔

پگھلی ہوئی برف کی نمی کے باعث تارکول چڑھی سڑک کچھ مزید کالی دکھتی تھی۔

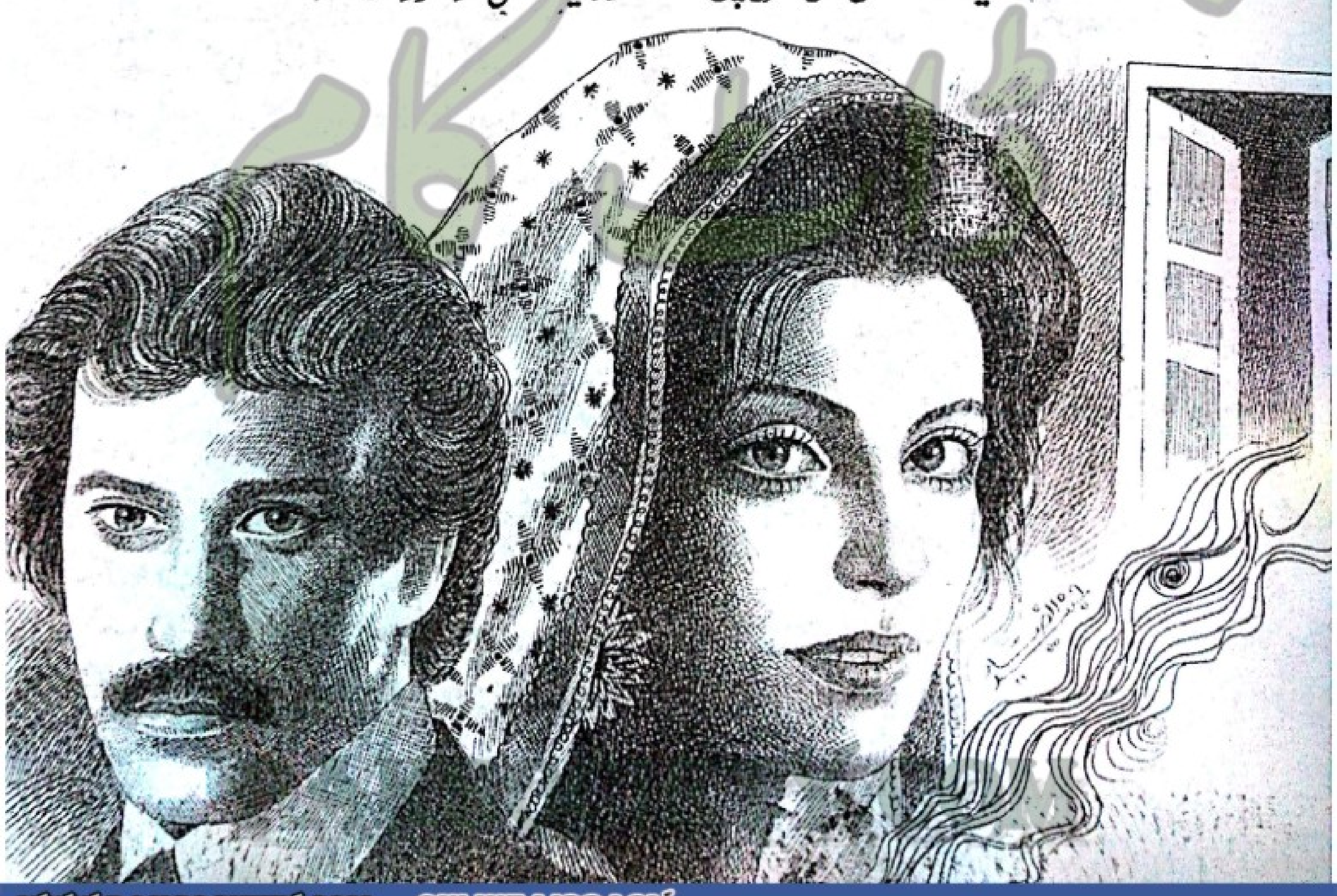
اس نم آلود کالی اور چمکتی سڑک پر تیزی سے آتی وائٹ لیموزین کے سیاہ ٹائر چرچرا کر رکے تھے اور پھر اتنی ہی تیزی اور کسی قدر عجلت سے گاڑی کی پچھلی طرف کا دروازہ باہر کو دھکیلا گیا تھا۔ درمیانی ہیل والے سنگ جراحت کے سے سفید جوتے جن میں نقرئی پن کی جھلک تھی، نے سڑک سے برف اور برف سے اوک (OAK) بلڈنگ کے دروازے تک کی سیڑھیوں کا فاصلہ بھی اسی عجلت میں طے کیا تھا۔

دروازے کے اندر داخل ہو کر وہ غائب ہو گئی تھی۔

لیکن اپنے روشن سراپے کی پرچھائی اس نے کہیں پیچھے ہی چھوڑ دی تھی۔ اس کے سفید قیمتی برائیڈل (عروسی) گاؤن کا دامن، جو پیروں کو چھوتا تھا اس سے نمی اور میلا پن جھلکتا تھا۔ دامن پر گرد اور نمی کے باعث بنی ہوئی بے ڈھنگی مصوری کے خشک و تر شاہکار ثبت تھے۔ اس جگہ آنے سے پہلے وہ مزید دو جگھوں پر جا چکی تھی۔

ایک سینٹرل پارک..... جو اس کی محبت کا ماخذ تھا۔

اور ایک "فالی" ریسٹورنٹ۔



مکمل ناول



جہاں کے شیف کبابوں کو سینکنے کے لیے میپل کی سوکھی لکڑی کا استعمال کرتے تھے اور میپل کی لکڑی پر پکے ہوئے وہ کباب شہرام کی مرغوب ڈش تھے' وہ اکثر اوقات اسی ریسٹورنٹ یا اس کے اردگرد ہی کہیں پایا جاتا تھا۔

آج وہ اسے ان دونوں جگہوں پر کہیں نہیں ملا تھا۔ یہ تیسری جگہ تھی۔ ایک طرح سے آخری بھی.... وہ جانتی تھی کہ پھر اس کے بعد کیا تھا.... صرف دربدر کی خاک .... لامتناہی تنہائی .... اور خود ساختہ عذاب کی اذیت۔

شہرام کے کمرے کا دروازہ بند تھا' اسے اس کی توقع نہیں تھی' اگرچہ اس کا دل پہلے ہی اس کی گواہی دے چکا تھا۔

وہ واپس لوٹی تھی۔

لینڈ لیڈی کے دروازے تک پہنچ کر اس نے اطلاعی گھنٹی کو دبایا نہیں تھا' بلکہ دبائے ہی رکھا تھا' وہ اتنی عجلت اور اتنی بے قراری کی حالت میں تھی کہ اسے یقین تھا کہ اگر اب.... ہاں اگر اب وہ کہیں بھی کسی غلطی یا کوتاہی کی مرتکب ہوئی تو وہ شہرام کو دوبارہ اپنی پوری زندگی میں کبھی نہ دیکھ سکے گی۔

وہ ٹھیک سوچ رہی تھی' لیکن غلطی کرنے کا وقت آنے والا نہیں تھا۔ وہ وقت آکر جاچکا تھا.... اور وہ شہرام سمیت بہت کچھ کھودینے والی تھی۔

دروازہ کھلا اور لینڈ لیڈی ایمنڈا گھنٹی کے اس غیر مہذبانہ استعمال پر اپنی ناگواری چھپا نہ سکیں۔

"فرمائیے!" بیانکا کو پہچاننے میں انہیں چند ہی لمحے لگے تھے۔ یہ چہرہ ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ چند لمحے بھی اس لیے لگے کہ وہ آج حد سے زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔

بیانکا کو دیکھ کر اور وہ بھی اس حالت میں دیکھ کر وہ حیران ہوئی تھیں۔

"شہرام.... شہرام کہاں ہے؟"

وہ تین منزلوں کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی تھی اور مایوس واپس آئی تھی۔ اس کے باعث اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ سوال اس نے بمشکل مکمل کیا۔

لیڈی ایمنڈا کا منہ اتر گیا۔ اس سوال کا جواب یقیناً" بیانکا کو مزید پریشان کردینے والا تھا۔ وہ ایک ٹک اس کا سراپا دیکھے گئیں۔

وہ وائٹ برائیڈل گاؤن میں ملبوس.... تازہ کھلے زخم کی مانند گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک اور مہنگے ہیروں سے دمکتے زیورات پہنے ہوئے تھی۔ وہ کہاں سے آرہی تھی.... کیا چھوڑ کر آرہی تھی۔ ان سارے سوالوں کے جواب اس کے تن سے لپٹی ایک ایک چیز دے رہی تھی۔ برعکس ہربات کے اس روپ میں وہ اتنی دلکش اور اتنی حسین لگ رہی تھی کہ اگر اس کے چہرے پر ہوائیاں نہ اڑ رہی ہوتیں تو لیڈی ایمنڈا اسے گلے سے لگا کر بے تحاشہ چوم ڈالتیں۔

"وہ چلا گیا...." انہوں نے سچ بتادیا۔

"کہاں....؟" زمین اس کے پیروں کے نیچے اس کی آنکھوں کی پتلیوں کی طرح کانپنے لگی۔

"واپس.... اپنے ملک.... البانیہ۔" ایمنڈا نے اداسی سے کہا۔

"کب...."

"کل صبح.... اس نے سارا حساب چکتا کردیا تھا اور وہ اپنا سارا سامان لے گیا ہے.... میں نے خود اس کا ایئر ٹکٹ دیکھا ہے۔"

آخری بات کا اضافہ انہوں نے اس لیے کیا تھا کہ بیانکا یقین کرلے کہ وہ کل صبح چلا گیا ہے۔

وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھیں۔ وہ واقعی چلا گیا تھا۔ گرنے سے بچنے کے لیے بیانکا نے سیڑھیوں کی ریلنگ کو تھاما تو ایمنڈا کو پتا چل گیا کہ ان کی بات کو سچ ہی مانا گیا ہے۔

دہلیز اور سڑک کے درمیان کی سات سیڑھیوں کو اس نے پشت کی طرف سے طے کیا تھا۔ جیسے واپسی کے سفر میں بھی آگے ہی جانے کی خواہش مند ہو۔ اور چکنی سیڑھیوں پر سے پھسلتے خود کو سنبھالنے کا اس نے

تردد ہی نہیں کیا تھا۔ اب اس سے زیادہ وہ اور کہاں گرے گی۔ کھائی میں گرنے والے کے پاس ایک اطمینان تو ہوتا ہے اگرچہ لمحے بھر کے لیے ہی سہی کہ وہ اب اس کے بعد مزید نیچے کہاں جائے گا۔

شاید وہ اس بھاگ دوڑ سے تھک چکی تھی یا خود کو سنبھالتے سنبھالتے ہار گئی تھی۔ برف کی پتلی سی تہہ چڑھے آخری اسٹیپ پر ڈھے گئی۔ سارے مشکل امتحانوں کے بعد یہ آسان امتحان اس کی زندگی میں ابھی باقی تھا۔ جس میں وہ پہلے سے ہی فیل ہو چکی تھی۔

اس کا نم گاؤن مزید گیلا ہونے لگا اور ٹھنڈے ماربل نے برف کی یخ بستگی کو اس کے پورے وجود میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں اتنا اندھیرا بھر گیا تھا جیسے مدتوں ان آنکھوں نے سورج نہ دیکھا ہو۔

"شہرام.....!" اور یہ لفظ اس کے لبوں سے یوں ادا ہوا جیسے اس کی پور پور زخمی ہو۔

گھٹنوں میں منہ دے کر اس نے وہ آسن جما لیا جو کسی کو ابدی طور پر پا لینے کے لیے رواں رکھا جاتا ہے۔

"شہرام... اب تم مجھے کیسے ملو گے شہرام.....

اب میں تمہیں کہاں کہاں ڈھونڈوں شہرام....."

خلاؤں میں دیکھتے ہوئے اس نے زوال آلود سورج سے کہا۔

اور موسم نے نہ بدلنے کی جیسے بے شمار قسمیں اٹھالیں۔

☆ ☆ ☆

رات دبیز تھی.....

مور کے چندر کی طرح..... اور چاروں اور پھیلی ہوئی تخم ریحاں کے پودے سے نکلنے والی کڑوی کسیلی خوشبو کی مانند.....

وہ نیویارک شہر کا ایک پر رونق، پر ہجوم اور وسیع چوراہا تھا۔ ایک طرح سے انجان بھی، بے گانگی سے چلتے چلتے وہ رک گیا تھا۔

اور یہاں کے باسیوں کے خیال کے مطابق اس جگہ سے بے دھیان ہو کر کوئی بدقسمت ہی گزر سکتا تھا۔

وہ بدقسمت تھا۔ بلاشک و شبہ..... اس نے دھیان دیا۔ ایسا بے ارادہ ہوا تھا۔ اس کی چندھی آنکھوں کو ایک نیون سائن کی چمک خیرہ کر رہی تھی۔ ایک بلیک سائن بورڈ جس پر سرخ لائٹس سے شائن کلب لکھا تھا۔ اور یہ سرخ لائٹ کسی نیزے کی طرح اس کی سوتی جاگتی آنکھوں میں گھسی چلی جاتی تھی۔ اس تحریر میں ایک پہچان کی چمک بھی تھی۔

ٹھیک چھ ماہ پہلے وہ اپنے یونیورسٹی فیلوز کے ساتھ یہاں سے گزرا تھا تو اس کے ایک دوست ڈیوڈ نے جو اپنے آبائی شہر کی ایک ایک سڑک ایک ایک عمارت کا تعارف ایک اعلانیہ فخر کے جذبات سے مغلوب ہو کر کرواتا تھا، نے اس کلب کے بارے میں بتاتے ہوئے اپنی گفتگو کو خصوصی لفظوں سے سجایا تھا۔

"اس کلب کے پاس بیانکا نامی ایک کمال کا اثاثہ ہے۔ تم اسے نیویارک کی ایلیکس چنگ (برطانیہ کی مشہور گرل D.J) کہہ سکتے ہو۔ میں ایک ماہ پہلے اس کلب میں گیا تھا اور ان دھنوں کی بازگشت جیسے ابھی بھی میرے کانوں میں قید ہے اور....."

ڈیوڈ شاید ابھی بیانکا کی تعریف میں مزید بولنے کا ارادہ رکھتا تھا، لیکن شہرام نے اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

"کیوں.... D.J(Disco Jocky) کا کام ایسا کون سا مشکل ہوتا ہے۔ محض ریکارڈ شدہ گانوں اور دھنوں کو چلانا....."

"یہاں آنے سے پہلے میرا نظریہ بھی کچھ کچھ تم جیسا ہی تھا۔ بٹ مائی ڈیئر فرینڈ..... دنیا میں بہت کم لوگ ہیں جو میوزک کو جنون کی طرح خود پر طاری کر لیتے ہیں.... اور ان سے بھی کم وہ ہیں جو اس جنون میں دوسروں کو بھی کھینچ لاتے ہیں..... یہ لڑکی ان ہی میں سے ایک ہے۔ یہ صرف ریکارڈ شدہ میوزک نہیں چلاتی۔ اس کی انگلیوں میں Tishrei cloud (ابر نیساں) قید

ہے۔ وہ جس کے بارے میں داستان گو کہتے ہیں کہ جو جب برستی ہے تو سارے غم بھلا دیتی ہے۔"

شہرام کے علاوہ باقی سب دوست ڈیوڈ کی اس تقریر سے متاثر ہونے لگے تھے۔ شہرام بھی ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا' لیکن وہ صبح کے دس بجے کا وقت تھا۔ کلب بند تھا اور کون جانتا تھا کہ شام تک ان کی توجیہات بدل جائیں گی۔

لیکن آج ایسا کچھ بھی نہیں ہونے والا تھا۔ اس کی ساری توجیہات کو زنگ لگ چکا تھا۔

شہرام چند لمحے اس بورڈ کو پڑھتا رہا۔ پھر اس نے خود کو کلب کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے پایا۔

"دیکھتے ہیں یہ ابر نیساں میرے غم پر برستی ہے کہ نہیں۔"

کلب ایک وسیع ہال پر مشتمل تھا۔ جس کی چھت کافی اونچی تھی۔ آدھے سے زیادہ حصے پر ٹرانسپیرنٹ کرسٹل کا ڈانس فلور بچھا تھا۔ داخلی راہداری کے سامنے دائیں بائیں دو لمبے کاؤنٹر تھے۔ جن کے پیچھے بارٹینڈر اپنے اپنے کرتب دکھانے میں مشغول تھے۔ ان دونوں کاؤنٹرز کے درمیانی خلا کے اوپر تقریباً "سروں سے اونچا اٹالین طرز کا ٹیرس قدرے باہر کو نکلا ہوا تھا۔ جہاں بہت بڑے سائز کا Disk Pioneer Four (چار ڈسک والا سسٹم) اور چھ انسانی قد کے سائز کے ساؤنڈ ڈیک پڑے ہوئے تھے۔ ٹیرس کی پشت پر V.Jing BOARD (ایک بورڈ جس پر میوزک کے ساتھ مختلف رنگ واشکال آتے اور جاتے ہیں) نصب تھا۔ میوزک کی آواز تیز تھی' لیکن یہ ابتدائی وارم اپ میوزک تھا۔

وہ اپنے لیے کوئی ایسا حصہ تلاش کرنے لگا جہاں اسے کوئی ڈھونڈنے سے بھی کھوج نہ سکے۔ اس کی نظریں بھٹک بھٹک کر تھک گئیں۔ آوازیں... شور... ہنسی مذاق... چھیڑ چھاڑ... خوشبوئیں' قہقہے' ادائیں' نخرے' ڈانس' ڈرنک سب کچھ آپس میں بری طرح مدغم ہو چکا تھا۔ ڈسکو لائٹ اور مختلف سمتوں میں لگی مختلف اشکال گھڑتی لیزر لائٹ کا نہ ختم ہونے والا سفر... شہرام کو اپنے اندر داخل ہونے کے فیصلے پر پچھتاوا ہوا تھا' زندگی کی طرف بلانے والی ان چیزوں سے شاید ان لوگوں کو ہی واسطہ ہوتا ہے' جو زندہ ہوں... وہ زندہ تو تھا' لیکن صرف ظاہری طور پر... جن کے دل مرجاتے ہیں' وہ عجز کا ایسا ہی روپ خود پر چڑھا لیتے ہیں... یہ وہ دوغلا لباس ہے' جو ستر پوشی میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا۔

اپنی پشت پر اسے کسی کی ٹکراؤ کا ہلکا سا احساس ہوا تو وہ پیچھے پلٹا تھا۔ ایک سانولی لڑکی شوخ ادا سے مسکرا رہی تھی۔

"....Would you like" لڑکی اپنا مدعا بیان کرتے کرتے رک گئی تھی۔ شہرام کو دیکھ کر اس کی اپنی رٹی رٹائی اور تہہ شدہ بات کی گرہیں کھل کر بکھر گئی تھیں۔

"ہائی سنتھ" (دیوتا اپالو کا دوست' بہت خوب صورت) لڑکی چلائی تھی۔

"ڈرنک کی آفر تو مجھے کرنی چاہیے۔" لڑکی اپنے بے تاب دل کی دھڑکنوں پر جیسے قابو پانا چاہتی تھی' لیکن کر نہیں پا رہی تھی۔

"جیسا میں سوچ رہی ہوں اور ویسا ہی ہوا تو میں دعا کروں گی کہ آج کی رات قیامت والے دن ہی ختم ہو' بولو کون سا مشروب پینا پسند کرو گے؟"

شہرام اس بات کا مطلب بخوبی جانتا تھا' اس نے سر کو اتنی آہستگی سے ہلایا کہ سانولی لڑکی سمجھ نہ سکی کہ وہ ہاں کہہ رہا ہے یا ناں... لیکن اس کے چہرے پہ آئے سنجیدہ تاثرات دیکھ کر وہ کچھ مایوس اور کچھ نامرادگی کی سی کیفیت سے مغلوب ہو کر اداس ہو گئی۔

"تمہارا بھی کوئی قصور نہیں... وہاں سے آنے والوں کو ہمیشہ گوری چمڑی ہی مرعوب کرتی ہے۔" لڑکی کہہ کر آگے چلی گئی تھی۔

شہرام کھڑے کھڑے واپسی کے لیے راستہ کھوجنے لگا۔ تب ہی تیزی سے چلتا میوزک قدرے آہستہ ہوا تھا۔

"Boys and girls and now the night is about to start"

(لڑکے اور لڑکیوں ... اور اب ... رات کی شروعات ہوئی چاہتی ہے)

اعلان کرنے والی کی اپنی آواز میں کانچ ٹوٹنے کی سی کھنک تھی۔

"انتظار ختم ہوا چاہتا ہے.... بیانکا ہمارے درمیان ہے.... جو...."

آگے کے الفاظ کانوں میں نہیں پڑے تھے۔ لڑکے اور لڑکیوں نے بیانکا کے نام پر ہی وہ شور اٹھایا تھا جو جنگل کی راتوں میں سیار کسی شکاری کو دیکھ کر اٹھاتے ہیں... سب اپنی اپنی سرگرمیاں چھوڑ کر ڈانس فلور پر بھاگے تھے۔ وہ بار کے قریب کسی مجسمے کی طرح ایستادہ رہا۔ کاؤنٹر کی سطح پر آدھے بھرے اور خالی جاموں کا ڈھیر پڑا رہ گیا تھا۔ اور اس کے سامنے کے سارے بار اسٹول جو پہلے پر تھے اب خالی ہوئے پڑے تھے۔ وہ ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔

"اورنج جوس ...." بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

بارٹینڈر نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔

"دوسرے مشروب بھی زیادہ مہنگے نہیں ہیں...." وہ کوئی راز بتانے کی سی آواز میں بولا۔

"اورنج جوس ... پلیز۔" شہرام نے قدرے آنکھیں نکال کر اور اپنے مطالبے پر زور دے کر کہا تو بارٹینڈر نے اپنا چہرہ تاثرات سے عاری کر لیا اور مطلوبہ فرمائش پوری کرنے کے لیے کاؤنٹر کے دوسری طرف چلا گیا۔

وہ ایسے اونچے اسٹول پر بیٹھا تھا جہاں سے سر سے اونچا ٹیرس با آسانی نظر آرہا تھا۔

"سر...!" اس کے سامنے اورنج جوس ٹیوب گلاس میں رکھ دیا گیا اور تب ہی ٹیرس کے بڑے اور چوڑے سانپ بل ستونوں کے پیچھے سے وہ برآمد ہوئی تھی۔

بیانکا... چہرے پر بھرپور مسکراہٹ سجائے۔

شہرام گلاس کو ہونٹوں سے لگانا بھول گیا... اور نظروں کو جھکانا بھی...

حسن اور درد... یہ وہ دو چیزیں ہیں جو انسان کسی بھی حالت، کسی بھی موسم میں محسوس کرتا ہے۔

ڈانس فلور پر منتظر ہجوم نے مختلف آوازیں نکال کر اس کا استقبال کیا تھا، اور یہ آوازیں شروع ہو کر پھر رکتی نہ تھیں۔ ان بے معنی آوازوں میں صرف ایک لفظ کی گردان شہرام کی سمجھ میں آئی تھی۔

Ritual Di Amour (محبت کی رسم.... رابرٹ تھامس کا مشہور گیت)

پھر جیسے دوسری فرمائشوں نے بھی اس فرمائش کے چاہنے والوں کی بڑی تعداد کے آگے اپنی اپنی فرمائش کے ہتھیار ڈال دیے اور سب مشترکہ طور پر اسی کی

فرمائش کرنے لگے۔

ٹیرس پر طمطراق سے کھڑی بیانکا مسکرائی تھی اور پھر اس نے اپنا بایاں ہاتھ ہوا میں لہرایا تھا۔ یہ اشارہ تھا۔ فرمائش کو قبول کرنے کا۔۔۔ پھر اس نے ہیڈ فون کانوں میں لگایا تھا۔

چھ انسانی قد کے برابر کے ڈیک نے Yanni (موسیقار) کی موسیقی کو فضا میں بکھیرنا شروع کیا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اور سنتے ہی سنتے اس گانے میں بہت سے انجان راگوں اور بدیسی دھنوں نے بھی آبسیرا کیا تھا۔

رقص کرو میرے ساتھ۔۔۔ بغیر رکے

بن جاؤ ایک طوفان۔۔۔ میرے سمندر کا

تھرکنے والوں نے نہ رکنے کا جیسے عزم کر لیا تھا۔

پانچ منٹ۔۔۔ دس منٹ۔۔۔ پندرہ منٹ۔۔۔

وقت گزرا اور۔۔۔

کوئی چیز ٹوٹ کر شہرام کے آس پاس بکھر گئی۔۔۔ وہ اٹھنا چاہتا تھا لیکن اٹھ نہ سکا تمہید بھی نہ باندھ سکا۔ ڈانس فلور اس کی نظروں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی دور بہت دور۔۔۔ دسترس سے باہر ہو گیا۔

اسے ناچنا نہیں آتا تھا۔ پر یہاں اس کے ناچ کے رموز پر دھیان دینے والا تھا ہی کون' پتا نہیں اس کی سماعت بھی اس کی طرح لاچار اور کمزور ہو چکی تھی یا بیانکا واقعی کسی اندرونی درد کو مرتب کر رہی تھی۔ کم از کم شہرام کو ایسا ہی محسوس ہوا۔

گردن اٹھا کر اس نے ٹیرس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ حسن جس کی صرف ایک بوند پورے سمندر کے پانی کا رنگ بدل دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اپنی آمد کے وقت سے یکسر مختلف عکس دے رہی تھی۔

Owen smith (مصور) کی پینٹنگ ابوالہول کا عکس۔

ابوالہول۔۔۔ جس میں ایک لڑکی پریشان چہرہ لیے ابوالہول کے پیچھے کھڑی ہے۔ اس کا سہارا لیے۔۔۔ اس کو پناہ بنائے۔۔۔ جس کی بھنوؤں میں پریشانی کے باعث گڑھے پڑ چکے ہیں۔

یہ لڑکی تو خود پناہوں کی تلاش میں بھٹکتی لگتی ہے۔

یہ مجھے کیا سہارا دے گی۔

شہرام کو اس کے بند ہونٹوں' نیم وا آنکھوں' کشادہ پیشانی اور دہکتے رخساروں کے نیچے کسی پوشیدہ کرب کا عکس نظر آیا' وہ کرب جسے وہی سمجھ سکتا ہے۔ جو خود کسی کرب سے گزرا ہو۔

''ابر نیساں۔۔۔''

اسے ڈیوڈ کا بیانکا کی تعریف میں بولا گیا لفظ یاد آیا اور ڈیوڈ سمیت ڈانس فلور پر ناچتے ان سب کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا۔

شاید ان سب پر x.t.c کا نشہ چڑھا ہوا ہے۔ اس لڑکی کی انگلیوں میں تو پروا قید ہے۔ جو پرانے زخم بھی جگا دیتی ہے۔ یہ انگلیاں نئے زخم مندمل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ شہرام نے فیصلہ کن سوچا۔

وہ یہاں اپنا غم غلط کرنے آیا تھا۔ لیکن شاید کلب کے کمال کے اثاثے کے پاس بھی اس کا علاج نہیں تھا۔ یہاں بھی وہی نوحہ ساز کی تان پر کستا تھا' جس نے البانیہ سے یہاں تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ماتم کر لیتا تو شاید راحت پا لیتا۔۔۔ لیکن اسے خود کو بسمل رکھنے کا سودا ہو گیا تھا۔

بے دل اور بے روح کی طرح شہرام نے ایک اچٹتی سی نگاہ دوبارہ بیانکا پر ڈالی تھی۔

سرخ ربن میں قید اس کے تمام تر گھنے اور سیاہ بال عروبہ کے استوائی جنگلوں کی عکاسی کر رہے تھے۔

''مجھے خود میں قید کر لو۔۔۔ ہنوز رقص کرو اور بالوں کو لہرا دو۔۔۔''

دفعتاً'' بیانکا نے ربن میں انگلی ڈال کر بالوں کو بڑے پیار سے اس سے آزاد کروایا تھا۔

لہریے دار بال کھلے تھے۔۔۔ لہرائے تھے۔۔۔ جھٹکا دے کر بے ترتیب کیے گئے تھے۔

اور عروبہ کے استوائی جنگلوں میں جیسے زلزلہ آ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

''رات کی شروعات ہوتی ہے۔۔۔ انتظار رخصت

ہوا چاہتا ہے... بیا نکا ہمارے درمیان ہے...‘‘

مارٹا نے اس کی آمد کا اعلان کانچ ٹوٹنے کی سی کھنک سے کیا تو وہ بے دلی اور سست روی سے ٹیرس کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

’’تو دن کا وہ وقت دوبارہ آگیا ہے، جب مجھے خود کو خود اذیتی کے کٹہرے میں کھڑا کرنا ہے...‘‘ اس نے سوچا اور سانپ بل ڈیزائن والے ستونوں کے پیچھے سے نکلنے سے پہلے اپنے چہرے پر سچی مسکراہٹ... نیچے ایک ہجوم اس کا منتظر تھا۔

’’Ritual Di Amour‘‘ سب نے چلا چلا کر فرمائش کا اظہار کیا تھا۔ اس نے ہاتھ لہرا کر ان کی فرمائش کو قبول کیا اور Yanni کی موسیقی کو آن کیا تھا۔

’’ایک گیت اور اندھیرا ماضی... اور اس اندھیرے کا خوف... کہ جس میں آنکھیں کھولنے کی ہمت نہیں ہوتی اور جو کھولو تو کچھ نظر نہیں آتا...‘‘ اس نے خود کلامی کی تھی اور دوسری طرف وائلن کی دھنوں والی ڈسک کو لگایا تھا...

مجھے اس اندھیرے ماضی کو یاد رکھنا ہے... اس اندھیرے میں ایک چیز چمکتی تھی... حیفہ مام کی آنکھوں میں آئے آنسو... جن کی یاد مجھے آگ کی طرح جھلساتی ہے... مجھے اس آگ کی۔ آبیاری کرنی ہے... دنوں‘ سالوں کے گزرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا... صدیوں کی لگاتار بارش بھی اس آگ کو ٹھنڈی نہیں کرپائے گی... یہاں تک کہ یہ آگ ایک تناور درخت بن جائے گی... ایک زہریلا درخت پھر اس درخت پر ایک سیب اگے گا... اور وہ زہریلا سیب گناہ گاروں کو چکھنا پڑے گا۔

گانے کے بول

میرے ساتھ رقص کرو... بغیر رکے

طوفان بن جاؤ... میرے سمندر کا

اس نے سازوں کی دھنوں کو لگا کر انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ کرنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھوں کو مصروف کرلیا تھا۔

’’ہنسو... رقص کرو... اپنے بالوں کو لہرادو۔‘‘ رِبن میں انگلی ڈال کر اس نے بالوں کو آزاد کرکے لہرایا تھا۔

چچا جلال نے اسے انہیں بالوں سے پکڑ کر ایک زوردار قسم کا جھٹکا دیا تھا۔

’’حرام زادی کرد ستخط...‘‘ وہ نفرت سے چلائے تھے۔

اسے حرام زادی کا مطلب نہیں پتا تھا... اس کی ماں پانچ وقت کی نمازی تھی اگر اسے حرام زادی کا مطلب پتا ہوتا تو وہ اسی وقت مرجانا پسند کرتی۔

’’الو کی پٹھی کرد ستخط۔‘‘

وہ ’’سی‘‘ کے بٹن کو اوپر کرتی چلی گئی تھی۔

’’کرد ستخط... کرد ستخط... کر کر... کر کر...‘‘ آواز نے ان لہروں پر سفر کیا تھا جو کسی صورت ہموار نہیں تھیں۔

’’طوفان بن جاؤ... طوفان بن جاؤ... طوفان بن جاؤ۔‘‘

’’یہ ایسے نہیں مانے گی... اپنی ماں پر گئی ہے... ڈھیٹ‘ کمینی‘ مکار‘ حرافہ۔‘‘ شہناز تائی نے کہا تھا۔

’’ڈھیٹ‘ کمینی‘ مکار‘ حرافہ۔‘‘

چاروں ڈسک اس کے دونوں ہاتھوں کے نیچے Scratching (ایک ایفکٹ) سے گزرنے لگیں۔

’’مکار‘ مکار‘ مکار۔‘‘

B اور D کے Volume کو اس نے اس قدر شدت سے تیز کیا تھا کہ وہ Pioneer کسی اچھی کمپنی کا نہ ہوتا تو دونوں بٹن یقیناً ٹوٹ گئے ہوتے۔

گانے کے بول۔

تمام بصارتیں تم پر مرتکز ہو جائیں

اور دکھا دیں... اپنی وارفتگی

Keytar اور Lira کی دھنیں ہال پر چھا گئیں تو رابرٹ کی آواز دھم ہوتے ہوتے گم ہونے لگی۔

اپنی ذات محبت کی اس رسم کے حوالے کردو

ایرانی Arpa نے اپنے پیہم جادو کا آغاز کیا تھا۔

نیچے لڑکے لڑکیاں اگر پاگل نہیں ہوئے تھے تو ہو جانے کے قریب ضرور تھے۔

"ایک جوتی مارو اس کے منہ پر۔۔۔ کیسے نہیں مانے گی یہ" اسے فیروزہ چاچی کے الفاظ یاد آئے تھے۔

پہلی ڈسک نکال کر اس نے اس طرح پرے پھینکی تھی جیسے وہاں فیروزہ چاچی کھڑی ہوں اور وہ ان پر بارود کا گولہ پھینک رہی ہو' بیانکا کی اس حالت میں مارٹا کو اپنے فرائض کا یا خوبی علم ہوتا تھا۔

"تیل چھڑک کر زندہ جلا دو۔۔۔ اس کو اور اس کی ماں کو۔۔۔" ان سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ پھر انہوں نے ایسا کیا کیوں نہیں۔۔۔ وہ تب ہی مرجاتی تو اس طرح روز روز تو جل جل کر نہ مرتی۔۔۔

لیکن موسیقی جلنے لگی تھی۔۔۔ کسی چڑیل کے لمبے ناخنوں کی کھرچ کی سی آواز پیدا کر رہے تھے اور رابرٹ کی آواز "صور" کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔

اجنتا کے غاروں میں چھپی چمگادڑوں کا چنگھاڑنا بھی ان آوازوں سے کہیں زیادہ بھلا تھا۔ بیانکا کے کان ان کراہوں کے عادی ہو چکے تھے۔ پھر بھی ہر روز ٹیرس پر بے حسی سے اپنی ڈیوٹی انجام دینا اسے اندر تک بھگو دیتا تھا۔

نیچے x.t.c کے نشے میں چور ہو کر سب ناچتے جاتے تھے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اس کی انگلیوں سے نکلتی دکھ کی تحریر کو پڑھ سکتا۔ کسی کے پاس وہ آنکھ نہیں تھی' جو اپنی ہی مردہ سلطنت پر خود کو ختم کر لینے کے ارادے باندھنے والی قلوپطرہ کے بھیانک عزائم جان سکتا۔

بیانکا کو ان سب کی بے حسی پر رونا سا آ گیا' لیکن وہ اسی طمطراق سے کھڑی رہی۔ جیسے اس کے لیے آنے والا ٹروجن (کاٹھ کا گھوڑا) اس کی آنکھوں کے آگے ہی جل رہا ہو۔

ڈیڈ الیاس کہتے تھے۔۔۔ "اپنے اپنے درجے اور حیثیت کی بات ہے' بیٹی۔۔۔ اوس تر تو کر سکتی ہے' لیکن پاک نہیں۔"

"آپ نے یہ کیوں نہ بتایا ڈیڈ کہ اپنی اپنی نظر اور محسوسات کی بھی بات ہوتی ہے۔ کچھ لوگ آتش فشاں کے پھٹنے کو بھی نظارہ سمجھ لیتے ہیں۔۔۔ جبکہ کچھ کو اس کی حدت کا خوف ہی بھسم کر دیتا ہے۔"

اس نے ڈیڈ الیاس کی روح کو جواب دیا اور نیچے ڈانس فلور پر نظر ڈالی۔

"میرا دکھ ان سب کے لیے نظارہ ہے۔ ہے کوئی جو اس نظارے سے مبہوت نہ ہو۔۔۔"

وہ مزید جوش سے اسکریچنگ کرنے لگی اور اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

"نہیں کوئی نہیں۔۔۔"

ڈانس فلور کے اردگرد کی ساری جگہ خالی تھی۔ لوگ آ رہے تھے۔۔۔ جانے والا کوئی نہیں تھا۔۔۔ یہ اطراف کی دیواریں اگر اتنی مضبوط نہ ہوتیں تو شاید یہ بھی جھوم اٹھتیں۔۔۔ نہیں کوئی ایسا نہیں تھا جو اس کی انگلیوں کی فسوں کاری کے حملوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو پاتا۔

چاروں سمت کا موازنہ کرتی اس کی نظر اچانک کہیں اٹکی تھی۔۔۔ ایک چیز تھی جو ساکت تھی۔ گہرے منجمد پانی میں مدتوں سے پڑی بند صدف کی طرح ایک دو انچ کی لکڑی کا ٹکڑا۔

فقط۔۔۔ ایک دو انچ کی لکڑی کا ٹکڑا۔۔۔

☆ ☆ ☆

جس بے دلی سے اس نے ٹیرس کی سیڑھیاں طے کی تھیں۔ واپسی پر اس سے کہیں زیادہ شکست خوردگی نے اس کے گرد حصار قائم کر دیا تھا' خلاف معمول آج اس کے قدم ڈریسنگ روم میں جانے کے بجائے بار کاؤنٹر کی طرف اٹھے تھے۔

اس کی آٹھ ماہ کی جاب میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ وہ ٹیرس سے اتر کر سیدھا ڈریسنگ روم میں نہیں گئی تھی۔ آج کے دن کی طرح پچھلے آٹھ ماہ میں کوئی چیز گہرے منجمد پانی میں مدتوں سے پڑی بند صدف کی طرح ساکت بھی نہیں ہوئی تھی۔

وہ اس ٹکڑے کے مالک کے بالکل مدمقابل آ بیٹھی تھی۔

اس ساکت ٹکڑے نے اسے ٹیرس پر ہی بڑی

بھیانک پریشانی سے دوچار کر دیا تھا "ہے کوئی جو اس نظارے سے مبہوت نہ ہو۔"

اس نے تفاخر سے سوچا اور تب ہی چاروں طرف کا موازنہ کرتی اس کی نظر کہیں اٹک کر بھٹک گئی تھی۔

یہ ایسا عجیب 'انوکھا اور توقع سے برعکس تھا کہ بڑی دیر تک وہ اسے فریب نظر ہی سمجھتی رہی تھی۔

فورڈسک Pioneer اس کی انگلیوں کے نیچے جیسے پتھر کا ہو گیا۔ ہیڈ فون اس کی گردن میں جھولنے لگا اور آگ پکڑتی تانوں پر گویا قطب شمالی کی سرد ہواؤں نے قابض ہو جانے کی ٹھان لی۔

اور بیانکا کی آنکھوں میں بے قراری کی سیاہی بھر گئی۔

ڈسکولائٹ کی کبھی مدھم اور کبھی تیز ہوتی روشنی میں اس نے ناچتے کودتے ہر ایک لڑکے اور ہر ایک لڑکی کو بہت غور سے دیکھا۔ "وہ" ان میں نہیں تھا۔ اس نے قریب کھڑی مارٹا اور سیڑھیوں پر ایستادہ دو حبشی باڈی گارڈز کو دیکھا۔ وہ ٹکڑا ان کی دسترس میں بھی نہیں تھا۔ پھر... پھر اس نے اپنی شکست کو کہاں دیکھ لیا تھا۔ وہ ہنسی میں پھنسی ہوئی مچھلی کی طرح مچلنے لگی۔

دائیں طرف بار کاؤنٹر کے چھ بار اسٹول خالی تھے۔ بائیں طرف بار کے چھ... نہیں وہ پانچ خالی تھے۔ اور ایک پر وہ... وہ بیٹھا تھا... شہرام ذلاری...

دور کہیں طبل بجا... اور ایک جنگ سی چھڑ گئی۔

ایک مقابل... ایک ضد...

پندرہ منٹ کی مزید زور آزمائی نے اسے نڈھال کر دیا۔ بیانکا کو کھیل کے اس حصے کی مہارت نہیں تھی۔ اس نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔

جنگ ختم کر کے اس نے ہیڈ فون مارٹا کو تھمایا تھا۔ تو مارٹا نے اسے اچنبھے سے دیکھا تھا۔ بیانکا عموماً "یا کم از کم دو گھنٹے تو ضرور ہی ٹیرس پر اپنی ڈیوٹی مکمل کرتی تھی۔

بیانکا نے مارٹا کے چہرے کے بدلتے تاثرات پر توجہ نہیں دی تھی۔ ڈانس فلور سے آتی ونس مور ونس مور کی صداؤں کو بھی اس نے نظر انداز کر دیا تھا اور نیچے اتر کر وہ شہرام ذلاری کے بالکل مدمقابل آ بیٹھی تھی۔

وہ یہاں اس کی اپالو دیوتا جیسی خوب صورتی کو سراہنے نہیں آئی تھی۔ وہ تو وجہ کھوجنے آئی تھی۔ خود پر فتح ہو جانے والی اس کی مجسم طبیعت کی۔ بار اسٹول پر بیٹھتے ساتھ ہی اس نے یہ کام پوری ایمان داری سے کرنا شروع کر دیا۔

اس ٹکڑے پر یقیناً "کچھ کندہ بھی تھا۔ لیکن فاصلے نے حد نظر کو محدود کر رکھا تھا۔ وہ چوکور ٹکڑا ایک کونے سے موٹی کالی ڈوری میں پرویا ہوا اس کی ہنسلی کی ہڈی کے جوڑ پر دھرا تھا اور وہ موٹی کالی ڈوری ایک متناسب اور خوب صورت گردن کے گرد ایسے لپٹی دکھتی تھی جیسے وہاں کوئی باریک کالا سانپ براجمان ہے اور سانپ کے اس آسن کے نیچے "ناگ منی" ہے۔

جو ایسا تھا تو غلط نہیں تھا۔ وہ... وہ واقعی ناگ منی تھا۔

وہ اورنج جوس کو کسی ایک خاص انداز سے پی رہا تھا اور جب جب وہ ٹھہرے ہوئے انداز سے گھونٹ بھرتا تو اس کی گردن کا کنٹھ نیچے آتے اور گم ہونے سے پہلے اس ٹکڑے کو چھونے کی ناتمام کوشش کرتا تھا۔

بیانکا نے رولنگ اسٹول کو موڑ لیا اور وہ مزید براہ راست ہو گئی۔

اس کی شیو بنا اسٹائل کے بڑھی ہوئی تھی اور سات آٹھ دنوں کی بڑھی شیو کے بال اس کے سرخی مائل گالوں کے نیچے کان کی لو کے قریب دو دائرے بناتے تھے 'بیانکا نے ان دائروں کو کھوجا اور خود کہیں کھو کر رہ گئی۔

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اسے یاد آیا تھا کہ وہ ایسے ہی پرکشش دائروں کو پہلے کہاں دیکھ چکی ہے۔ وہ ان دائروں کو بچپن سے دیکھتی چلی آ رہی تھی اور ساری زندگی دیکھتے رہنے کی خواہش مند تھی۔

وہ اس کے ڈیڈ الیاس کے گالوں پر پڑتے تھے۔

اور ڈیڈ الیاس کو یاد کر کے بیانکا کا دل کیا کہ وہ اس انجان لڑکے سے اجنبی نہ رہے "اس کے ارادے اور

سوچ میں شہرام کی جامد خاموشی حائل تھی۔ جو بار اسٹول پر بیٹھا اس قدر ٹھہراؤ اور طوالت کا شکار تھا کہ اس حالت میں وہ بیانکا کو اگستے روڈن (Rodin Auguste) کے مجسمے The thinker (سوچنے والا) لگا جس میں قدرت نے وقتی طور پر لمحوں کی جان ڈال دی ہو اور مجسمہ اس لمحے کی جان کو طول دے رہا ہو۔ وہ ٹیوب گلاس میں مشروب پی رہا تھا اور گلاس کے اندر کا سیال کسی جیلی کی طرح جما ہوا محسوس ہوتا تھا۔

کلب کا دستور تھا کہ مارگریٹ، مارٹینی اور کاک ٹیل گلاسز کے اسٹینڈ میں چارمز (charms) کی لڑی والا چھلا ڈالتے تھے۔ چارمز کرسٹل کے ہوتے تھے اور ان پر Power of love (محبت کی طاقت) کی مہر کندہ ہوتی تھی۔ ہلانے جلانے پر یہ چارمز بڑی دلکش جھنکار پیدا کرتے تھے۔

بیانکا سوچنے لگی کہ کلب انتظامیہ اگر کسی طرح ٹیوب گلاس میں چارمز والا چھلا ڈالنے میں کامیاب ہو بھی گئی تو اس لڑکے کی ہاتھوں کی جنبش کرم کے باعث ان چارمز نے جھنکار تو دور حرکت بھی نہیں کرنی تھی۔

کلب کی ایک اور روایت بھی تھی کہ کلب میں داخلے کے وقت ہر ایک کو کالی روشنائی والی love of Power کی مہر اپنے جسم پر کہیں بھی لگوانی پڑتی تھی، بیانکا کو آج تک اس روایت سے اختلاف نہ ہوا تھا۔ اکثر کلبوں کے ایسے ہی الٹے سیدھے رواج تھے۔ لیکن شہرام کی کلائی پر کالی روشنائی والی مہر دیکھ کر بیانکا کو ناگواری کا احساس ہوا اور ساتھ ہی اسے داخلی دروازے پر کھڑے کسی سانڈ جتنے تنومند حبشیوں کی بینائی پر بھی شبہ ہوا۔

اس لڑکے کو یہ مہر لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا وہ دیکھ نہ سکتے تھے کہ یہ تو خود سراپا طاقت محبت ہے۔

”سنو!“ بہت سوچ کر بیانکا نے اسے پکارا تھا۔ جسے شہرام شاید سن ہی نہیں پایا تھا۔

”تو بس صرف اتنی سی وجہ تھی۔“ بیانکا کو اپنی سوچ پر شرمندگی ہوئی اور شہرام کے قوت سماعت سے محروم ہونے پر دکھ بھی..... وہ پرے ہوگئی..... اور مطمئن بھی۔

قریب بیٹھا شہرام بیانکا کی نظروں کی تاب سے دور ہو گیا..... وہ پہلے بھی دور ہی تھا بہت دور ہر اس کی سوچ کے دھاگے البانیہ کی سرزمین میں گڑے تھے اور ان دھاگوں میں وہ الجھتا جا رہا تھا۔

بابا ذلاری نے کہا تھا۔

”ادھورا علم اور کند چھری ..... دونوں ایک سا تڑپاتے ہیں۔“

”آپ یہ کیوں نہ سمجھ سکے بابا کہ ادھورا راز اور پشت کا وار بھی صیقل ہوئے خنجر سے کم خطرناک نہیں ہوتا۔“

دفعتاً“ شہرام کو ٹھوکر لگی۔ اپنی ہر سوچ کے دھاگوں سے وہ بھول گیا کہ یہاں کوئی اس کے دوست طامیر جیسا نہیں ہے۔ جس نے البانیہ میں اسے ٹرک کی زد میں آنے سے بچا لیا تھا۔

بے بس غصے اور آپے سے بڑھتے رنج کی ایک لہر اس کے سینے سے اٹھی، اور اس کے سست دماغ پر آکر حاوی ہو گئی۔ ٹیوب گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے ہی قدموں میں گر کر چور چور ہو گیا۔

وہ اپنے حواس میں نہیں تھا، ورنہ یقیناً“ اس چھناکے کی آواز پر ہی ضرور چونکتا..... اپنے ڈولتے جسم کو سنبھالنے کے لیے اس نے ایک آخری بار کوشش کی تھی اور ایک ہاتھ غیر ارادی طور پر بار ٹینڈ کی طرف اور ایک بیانکا کی طرف بڑھایا تھا۔ دونوں کے کچھ سوچنے سمجھنے سے پہلے ہی وہ بلوری فرش پر بیانکا کے قدموں میں گر کر ڈھیر ہو گیا تھا۔

ایک ویٹر جلدی سے ہاتھ میں پکڑا تھال بار کی سطح پر رکھ کر شہرام کی طرف بڑھا تھا۔

اور حیرت سے جامد ہوئی بیانکا سوچنے لگی تھی۔

”کیا اورنج جوس پینے سے بھی کسی پر مدہوشی طاری ہو جاتی ہے۔“

✡ ✡ ✡

اپنے اپارٹمنٹ کی سیڑھیاں کسی قدر تیزی سے چڑھ کر اور دروازے کو تقریباً“ دھکیلتے ہوئے وہ اندر

داخل ہوئی تھی۔ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے آج وہ خلاف عادت دوسرے کمرے میں گئی تھی۔ جہاں ٹیپ لگے ایک دوجے کے اوپر تلے رکھے بہت سے بند کارٹنز میں اس کے پرانے گھر کا سامان پڑا ہوا تھا۔

جب سے وہ اپارٹمنٹ میں منتقل ہوئی تھی' اس کمرے میں آنے اور اس پرانے سامان کو استعمال کرنے کی اسے ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ لیکن آج جیسے اس کے سینے میں کسی نے دہکتی ہوئی سلاخ اتار دی تھی۔

ایک کارٹن پر سے ٹیپ کو کھینچ کر اتارتے ہوئے وہ اندر موجود چیزوں کو باہر نکال نکال کر فرش پر ڈھیر بنانے لگی تھی۔ دیکھتے دیکھتے سارا کارٹن تقریباً" خالی ہو گیا۔ وہ دوسرے کارٹن کی طرف بڑھی۔ پھر تیسرے کی طرف....

چوتھا کارٹن کھولنے سے پہلے تک کمرے کا سارا فرش مختلف چیزوں سے ڈھک چکا تھا اور اس برق رفتاری سے یہ کام سرانجام دیتے دیتے اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ تب کہیں جاکر اسے اپنی مطلوبہ چیز ملی تھی.... تصویروں کا البم۔

کاؤچ پر بیٹھ کر وہ ایک ایک تصویر کو بڑے غور سے دیکھنے لگی تھی۔ جیسے اپنی زندگی میں پہلی بار ان چہروں کو دیکھ رہی ہو۔ آنسو اس کے اندر ہی اندر کہیں دفن ہونے لگے تھے۔

فوٹو البم میں ان گنت تصویریں ایسی تھیں جن میں ڈیڈ الیاس کی شیو بڑھی ہوئی تھی، لیکن بالوں کے وہ دائرے.... وہ دلکش دائرے شاید کیمرے کا عدسہ فوکس نہیں کر سکا تھا۔

بیانکا نے خود کو پھر سے یاد دلایا کہ اسے رونا نہیں ہے.... وہ جتنا رو سکتی تھی۔ بہت پہلے رو چکی تھی.... اب اسے صرف ایک آخری بار رونا تھا.... اور وہ وقت ابھی دور تھا۔

اسی وقت کے لیے وہ دن رات منصوبے بنا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

بیانکا کی موجودہ زندگی کی کتاب میں سے اگر کلب کی ہنگامہ خیز جاب کے صفحے کو پھاڑ کر پھینک دیا جاتا تو یہ زندگی ایک بوڑھی کٹھور بیوہ کی سی زندگی تھی۔ ایسی بوڑھی بیوہ جس کے پانچ جوان بیٹے پانچ مختلف براعظموں میں رہائش پذیر ہوں اور وہ روز بلاناغہ گھر سجا کر ان کی آمد کا انتظار کرتی ہو۔

انتظار جو دل کی بے قراری اور آس سے جنم لیتا ہے۔ طویل ہو جائے تو آنکھیں پتھرا جاتی ہیں اور طویل تر ہو جائے تو دل چٹان بن جاتا ہے۔

وہ پچھلے آٹھ ماہ سے انتظار کی اس چوکھٹ میں کھڑی تھی جس میں دل کی حرکت ہر بار دق کے مریض کی طرح خطرے کی گھنٹی بجاتی تھی۔ پیچھے جانا اسے منظور نہیں تھا اور آگے کے تمام راستے اندھے کنویں کو جاتے تھے۔ اس کے باوجود اس نے خود کو زندہ رکھنے کی ہر کوشش پر عمل کیا اور اس کوشش نے اسے اندر تک سے توڑ دیا۔ اس طرح کہ دنیا کا کوئی واقعہ اب اسے حیران نہیں کرتا تھا۔

کل رات بڑے عرصے بعد اس نے بلوری فرش پر لڑکھڑا کر گرتے شہرام کے لیے اپنے دل میں درد محسوس کیا تھا اور اسے خود پر حیرت ہوئی تھی۔ اگر سب اسی طرح معمول پر آتا رہا تو پھر اس کی بربادی کا نظارہ ایسا ہی ہونے والا تھا جیسے روم کے جلنے کا....

شام میں وہ سارے خیالات جھٹک کر کلب گئی تھی تو اتفاقیہ طور پر ڈینئل اور جوڈتھ بھی اس لڑکے (شہرام) کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔

"اس کے دائیں بازو کی ہڈی میں بہت زیادہ فریکچر آیا ہے۔"

ڈینئل خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے اپنی "بو" درست کر رہا تھا۔ دوسرے آئینے کے سامنے کھڑا جوڈتھ اپنی گردن پر بنے "بیوٹی اینڈ دی بیسٹ" کے ٹیٹوز کو رنگنے میں مصروف تھا۔ وہ ہر روز یہ عمل بڑے شوق سے پورا کرتا تھا۔ اس کا خیال نہیں بلکہ یقین تھا

کہ یہ چیز اس کی بیوٹی کو مزید بڑھا دیتی ہے۔ جبکہ حقیقت میں لوگ اسے دیکھ کر سوچتے تھے کہ یہ شخص دن بدن بیسٹ (درندہ) کیوں بنتا جارہا ہے۔

دونوں کی گفتگو کو غیر دانستہ سنتے اپنے ہونٹوں پر اورنج رنگ کی لپ اسٹک لگاتی بیانکا کے ہاتھ نجانے کیوں خود بخود رک گئے تھے۔

"اس کی جیب سے کوئی آئی ڈی' وزیٹنگ کارڈ یا ایڈریس نہیں ملا... اس کا پرس بھی تقریباً" خالی تھا اور اس کے پاس سیل فون بھی نہیں تھا۔ گرین روم میں پڑے اس کے سفری بیگ میں بھی پاسپورٹ اور چند معمولی کپڑوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔"

"حیرت ہے.... کیا وہ ایئرپورٹ سے سیدھا کلب ہی آرہا تھا۔" جوڈتھ گردن کو آتشی رنگ میں پینٹ کرنے کے بعد جھک کر شوز کے تسمے کسنے لگا تھا۔

"اور منحوس منیجر کہنے لگا کہ میں صلہ رحمی کے تحت ہسپتال جاکر اس کے لیے فنڈ سے علاج کا فارم فل کر دوں...."

"بدبخت شخص اگر اسے انسانی ہمدردی کا اتنا ہی بخار چڑھا رہتا ہے تو وہ خود کیوں نہ چلا گیا.... ہماری ٹپ میں سے بھی دسواں حصہ فضول میں ہی کھرا کرلیتا ہے۔"

جوڈتھ کو منیجر کے اگلے پچھلے سارے غصے یاد آگئے تھے۔

"وہ کس ہسپتال میں ہے....؟" مڑ کر بیانکا نے بلا سوچے سمجھے پوچھنا چاہا تھا۔

ڈینئل اور جوڈتھ وہاں سے جاچکے تھے' ورنہ وہ واقعی یہ سوال پوچھ ڈالتی۔

"تجھے اس سارے معاملے سے کیا سروکار....؟"

لپ اسٹک لگانے کے رکے ہوئے عمل کو پورا کرتے ہوئے وہ ٹیرس کی طرف بڑھی تھی۔ مارٹا نے اس کی آمد کا اعلان کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

رامش گر ہوا میں بڑے بھید بھرے گیت قید تھے۔

وہ خود جو سنگیت کی ماہر تھی ہوا کے ان پرنور گیتوں کے آگے اس نے دنیا کے تمام نغموں' گیتوں' الاپوں اور برہوں کو بے ضرر اور بے اثر جانا....

سرسوں کے پھولوں سے رنگی ہوئی صبح درختوں پر جھکتی چلی آتی تھی اور سونے رنگ کا پارہ گہرا ہوتے ہوتے ہر سو بکھرنے لگا تھا۔

اس نے ٹھنڈی اوس کی نمی والی راحت کو اپنے پیروں کے نیچے رفتہ رفتہ گم ہوتے ہوئے محسوس کیا اور قریب پڑے جوتوں کو واپس پہن لیا۔

وہ کافی دیر سے یہاں موجود تھی۔ آج صبح اٹھتے ساتھ ہی وہ اس پارک میں چلی آئی تھی۔ تب جوگنگ کرنے والوں کا بہت رش تھا۔ لیکن پھر جوں جوں دن چڑھنے لگا رش بھی کم ہوتا گیا۔

جوتے پہن لینے کے بعد وہ تھوڑی دیر مصنوعی جھیل کی ناسپاس لہروں میں سرائیت کرتی سورج کی شعاعوں کو دیکھتی رہی تھی۔ دھوپ روز والا جوبن حاصل کرنے میں کامیاب ہوچکی تھی۔

چمکیلی دھوپ کے سحر کو اپنی باہیں کھول کر اس نے اپنا آپ اس کے سپرد کیا تھا اور ایک بار پھر اللہ سے اپنی کامیابی کے لیے دعا مانگی تھی۔ وہ بڑی دیر تک اسی حالت میں رہی۔ آج بڑے دنوں کے بعد اس نے خود کو خوش کرنے کے لیے وقت نکالا تھا۔

"آرائشی پیاز" کی جامنی باڑ کو کسی تتلی کی طرح چھوتے ہوئے وہ واپسی کے لیے گیٹ کی طرف بڑھنے لگی.... جب اس کی نظر مخالف سمت میں بنی کینٹین کے کاؤنٹر پر اسے کھڑے دیکھ کر دوبارہ پیچھے پلٹی تھی۔

اس کی نظر رکی تو وہ خود بھی محو سفر نہ رہ سکی۔

وہ بلاشک وشبہ وہ ہی تھا۔ جس کے سرہانے وہ ایک ہفتہ پہلے وائرللی کا گلدستہ رکھ آئی تھی۔

اس دن سے پچھلی رات اس نے ٹیرس سے اتر کر ڈینئل کو تقریباً" جھنجوڑ ہی ڈالا تھا۔

"اس ہسپتال کا نام کیا ہے۔ جس میں وہ لڑکا ایڈمٹ ہے؟" ڈینئل کے تھال میں چھ جام پڑے ہوئے تھے اور بیانکا کے اس بری طرح اسے ہلانے سے وہ چھ کے

چھ جام چھلکے تھے۔

"کون سالڑکا۔۔۔؟" خود کو کسی حد تک غصے کی حالت میں ظاہر کرتے ہوئے ڈینئل نے بھونچکا ہو کر پوچھا تھا۔

"جو کل رات یہاں پر گر گیا تھا۔۔۔"

بیانکا نے بار اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔ اسے ڈینیل کے تاثرات کی ذرہ برابر پروا نہیں تھی۔ ڈینیل نے اسے ہسپتال کا نام بتادیا تھا۔

اگلے دن وہ صبح جلدی اٹھ کر ہسپتال گئی تھی۔ شہرام کو تلاش کرنے میں اسے چند منٹ ہی لگے تھے۔ اگرچہ اس کا نام بھی اسے یہاں آکر ہی معلوم ہوا تھا۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے وہ اپنے یہاں آنے کی جھوٹی سچی وجوہات گھڑتے ہوئے الفاظ کو ترتیب دینے لگی تھی، لیکن اسے کچھ بھی بولنا نہیں پڑا تھا۔ شہرام میٹھی اور گہری نیند سو رہا تھا۔ اس طرح کے اس کی طرف ایک ٹک دیکھتے ہوئے بیانکا کو اپنے دل پر خون کی گردش تیز تر ہوتی محسوس ہوئی۔

اس کے سرہانے کے پاس وہ واٹرللی کے پھولوں کا ایک چھوٹا گلدستہ رکھ کر باہر آگئی تھی۔

"مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔۔۔ نجانے کیوں بعض اوقات میں بہت بے وقوفی والی حرکتیں کرتی ہوں۔۔۔" باہر نکل کر وہ سوچنے لگی تھی۔

ایک ہفتہ وہ نہ چاہتے ہوئے کلب میں اس کی آمد کا انتظار کرتی رہی تھی۔ کل رات ہی وہ اس انتظار سے کچھ غافل ہوئی تھی اور کل رات ہی اسے پتا چلا تھا کہ شہرام گرین روم سے اپنا شولڈر سفری بیگ لے کر جاچکا ہے۔ جس میں اس کے پاسپورٹ کے علاوہ چند کپڑے بھی موجود تھے۔

اور آج وہ اسے پھر نظر آگیا تھا۔ بلو جینز اور وائٹ ہاف بازو کی ٹی شرٹ میں۔۔۔ ایسے کہ اس کا دایاں ہاتھ مکمل طور پر سفید پٹیوں سے کسا ہوا تھا۔ اپنے قدموں کو اس کی طرف بڑھنے سے روکنے کے لیے بیانکا نے کوئی کوشش بھی نہیں کی۔

اس کا دایاں بازو ساکن تھا اور بائیں ہاتھ سے وہ اپنی ہپ پاکٹ میں سے شاید والٹ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک ہاٹ ڈاگ اس کے ہاتھ میں تھا اور دکان دار اس کی اس دیر پر بڑی کوفت کا شکار لگ رہا تھا۔

"اس میں سے ان کے ہاٹ ڈاگ کے پیسے کاٹ لیں۔"

بیانکا نے اپنے پرس میں سے پیسے نکال کر دکان دار کی طرف بڑھائے تھے۔

یک لخت شہرام نے گردن اٹھا کر بیانکا کی طرف دیکھا تھا اور اس کی آنکھوں میں پہچان کی ہلکی سی چمک آکر گزر گئی تھی۔

"نہیں، میں پیسے خود ادا کر سکتا ہوں۔" وہ گویا ہوا اور حیرت سے بیانکا کی آنکھیں پھیل گئیں۔۔۔ تو وہ سن سکتا تھا۔۔۔ اور بول بھی سکتا تھا۔۔۔ ایک انجانی خوشی کا احساس اس کے چہرے سے جھلکنے لگا۔

"تکلف میں مت پڑو۔۔۔ ہاٹ ڈاگ کی پرائس کچھ ایسی زیادہ بھی نہیں ہے۔ میں نے پارک میں اکثر بوڑھوں کو اسے توڑ کر پرندوں کو کھلاتے دیکھا ہے۔" بقایا پیسے لے کر وہ اپنے پرس میں ڈالتے ہوئے بولی۔

"تمہارا بازو اب کیسا ہے۔۔۔ مجھے افسوس رہے گا کہ میں تمہیں بروقت سہارا نہ دے سکی" قریبی بینچ کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا اور بتایا بھی تھا۔

"یہ بہتر ہے۔۔۔"

وہ مسلسل بائیں ہاتھ سے اپنی ہپ پاکٹ کے ساتھ الجھا ہوا تھا۔ بینچ تک پہنچنے پر وہ اپنا والٹ نکالنے میں کامیاب ہو گیا تو بیانکا اور اپنے درمیان اس نے اس والٹ کو رکھ دیا تھا۔

"میں نے کہا نا اس کی ضرورت نہیں۔" بیانکا نے والٹ کو دوبارہ اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

"تمہیں اتنی جلدی گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ میرا نہیں خیال کہ یہ اتنا ہی بہتر ہو گیا ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔۔۔ کیا تمہاری فیملی میں سے کسی نے تمہیں اس طرح باہر نکلنے سے نہیں روکا۔" وہ خود کو ہر بات سے لاعلم ظاہر کرنے لگی۔

شہرام چند لمحے خاموش رہا تھا۔
"میں یہاں پر اکیلا ہوں۔۔۔"
وہ زیادہ حیران نہیں ہوئی 'ایک تو اس وجہ سے کہ وہ ہر بات پہلے سے جانتی تھی اور دوسرا اس وجہ سے کہ وہ خود اکیلی تھی۔
"ہم سب ہی اپنی اپنی جگہ پر اکیلے ہیں۔۔۔ پھر بھی اپنا خیال ہمیں کسی کی نصیحت کے بغیر بھی رکھنا چاہیے۔"
کچھ توقف اور ایک طرح کا فیصلہ کر لینے کے بعد اس نے سلسلہ کلام دوبارہ جوڑا تھا۔
"نرس نے مجھے بتایا تھا کہ تمہیں ٹھیک ہونے میں کم از کم ایک ماہ لگے گا۔"
وہ بات جسے وہ خود سے بھی چھپا کر رکھنا چاہتی تھی وہ بات اس کی نوک زبان سے انجانے میں نہیں پھسلی تھی۔ بلکہ وہ خود اس بات کو بتا دینا چاہتی تھی۔
شہرام چونکا تھا۔۔۔ اور پھر دوبارہ اپنے قدموں تلے کی زمردی گھاس کو دیکھنے لگا تھا۔
اس کی جھکی آنکھوں میں "بدھا" کی بند آنکھوں کے اسرار و کشف کی الوہیت تھی۔
"پھولوں کا شکریہ۔۔۔"
بڑی دیر بعد اس نے کہا تو بیانکا کو اس کی آواز زمین کے کسی دوسرے خطے سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔
"ایک بات پوچھوں۔۔۔ ویسے اگر تم اجازت نہیں بھی دو گے میں تب بھی پوچھ ہی لوں گی۔۔۔ تم اس دن ڈرنک تو نہیں۔۔۔ تھے۔۔۔ تو پھر۔۔۔؟"
ریپر ہٹا کر ہاٹ ڈاگ گھماتے شہرام نے رک کر ایک گہرا سانس لیا تھا۔
"اس دن میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"
وہ بات کو ختم کرنے کے انداز میں بولا تھا۔
بیانکا نے واضح طور پر نوٹ کیا کہ وہ ہاٹ ڈاگ کو ایسے کھا رہا تھا جیسے یا تو اس کا پیٹ بھرا ہوا تھا یا پھر وہ آج سارا دن اسی ہاٹ ڈاگ پر گزارہ کرنے والا تھا۔
اپنے اور اس کے درمیان میں پڑے ہوئے اس نے اس کے والٹ کو دیکھا تھا۔ جس کی بیرونی حالت اندر کے کل اثاثے کی غماز تھی۔ وہ یقیناً" سارا دن اسی ہاٹ ڈاگ پر گزارہ کرنے والا تھا۔
خاموش بیٹھا جیسے وہ مزید گفتگو کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اور بیانکا اس تجسس کو اپنے ساتھ گھر لے کر جانا نہیں چاہتی تھی۔
"ڈینئیل نے بتایا کہ تمہارے پاس کوئی سیل فون' کارڈ' ایڈریس وغیرہ بھی برآمد نہیں ہوا۔ کیا تم اس ملک میں بالکل ہی نئے آئے ہو۔ کیا تمہارا یہاں کوئی نہیں ہے یا وہ اب تمہیں ایکسپٹ نہیں کر رہے۔ جیسا کہ یہاں اکثر ایشائیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ تمہاری رہائش کہاں ہے؟"
اس کے لیے اس میں سے کسی ایک سوال کا جواب بھی بہت تھا۔
شہرام ہاٹ ڈاگ کھانا جیسے بھول گیا اور بیانکا کی طرف دیکھتے ہوئے وہ قدرے تیز آواز میں بولا تھا۔
"آخر تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو۔۔۔؟"
یہ تیز آواز کسی پرندے کی چہکار سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ براہ راست بیانکا کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ لمحے بھر میں وہ لاتعلقی کی تصویر بن گیا۔
بیانکا نے اس سوال اور اس انداز کو اپنی بے عزتی محسوس کیا اور اپنے دماغ کو سنسناتے ہوئے پایا۔ وہ ایک ٹک شہرام کے چہرے کے پیچھے آئے جوبن چڑھے سورج کو دیکھنے لگی تھی۔ یہ ہی وجہ تھی یا کچھ اور۔۔۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔
پھر وہ ایک جھٹکے سے بینچ سے اٹھ کر گھومی تھی۔
بیانکا کے اس طرح اٹھنے سے شہرام کو احساس ہوا تھا کہ اس نے بلاوجہ تلخی بھرا رویہ اپنایا۔۔۔ قصور اس کا تو نہیں تھا۔
"غلطی میری ہے۔۔۔ میرا دماغ ازل سے ہی خراب ہے۔۔۔" بینچ کے پیچھے کی کالی اینٹوں والی روش پر آتے ہوئے بیانکا نے خود سے کہا تھا اور تیز تیز چلنے لگی تھی۔
"میں البانیہ سے ہوں۔" اپنی پشت پر اسے خوب صورت پرندے کی گونج دار آواز سنائی دی تھی اور اس کے قدم رک گئے تھے۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی۔

"Princeton یونیورسٹی (نیوجرسی) کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ لیکن اب میں نیوجرسی جانا نہیں چاہتا... اصل میں میں اب کہیں بھی جانا نہیں چاہتا... اس شہر میں میری کوئی رہائش نہیں ہے اور میں کوئی رہائش رکھنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا... رات کو یہ بینچ ہی میرے لیے بستر کا کام کرتا ہے اور یہ پارک میرا ابدی گھر ہے..."

وہ اس کے سارے سوالوں کے جواب دے کر خاموش ہو گیا تھا اور بیانکا روش کی سیدھ میں نصب باغ کے آہنی جنگلوں والے وکٹورین طرز کے بنے ہوئے بڑے بڑے گیٹ کو دیکھنے لگی تھی۔

فضا میں کچے طباشیر کی بو پھیلی تھی۔ سادھو صفت گلابی راج ہنسوں کا غول ندی کے پانی کے ساتھ اٹھکیلیاں کرنے لگا تھا۔ ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے اڑتے ندی کے باسی پانی کے چھینٹے ہوا کی روش پر سوار ہو کر بیانکا کو شرابور اور سرشار کرنے لگے تھے... (روش کے اطراف سیدھ میں آگے دور تک گئے چیری کے درختوں پر جیسے ایک دم سے بہار آ گئی تھی۔ اور سارے درخت گلابی رنگ کے پھولوں سے ڈھک گئے تھے۔

بیانکا نے گھر جانا تھا۔ اسے تیاری کرنی تھی۔ پھر ایئرپورٹ کے لیے نکلنا تھا... اور اس کے پیچھے وہ خوش مزاج شہزادہ بیٹھا تھا جو شاید اپنا سب ہی کچھ لٹا چکا تھا۔

اسے یاد آیا حیفہ مام کوئی بھی اہم کام کرنے سے پہلے کسی کی مدد کرنے کے عقیدے پر بہت سختی سے کاربند رہا کرتی تھیں۔

"میرے ساتھ چلو گے...؟" پلٹ کر بیانکا نے پوچھا تھا۔

"کہاں...؟" توقف کے بعد وہ چوبی بینچ کے تختے پر ٹھوڑی رکھے حیرت سے گویا ہوا۔

"گھبراؤ نہیں... تمہیں اغوا نہیں کروں گی..." وہ مسکرائی۔

"البانیہ سے تاوان دینے بھلا آئے گا بھی کون..."

اور اب کے وہ بے اختیار ہنسی تو ایک لمحے کے لیے شہرام کے ہونٹوں کے کونوں میں بھی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی تھی اور اس مسکراہٹ میں ققنس (ایک پرندہ جس کی چونچ سے 320 سر نکلتے ہیں) کے سارے سر شامل تھے۔

بیانکا اس کے لیے وہ ہی کر رہی تھی جو کسی وقت میں رچرڈ ہاؤس کے بوڑھے رابن اور اس کی بیوی نے اس کے لیے کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ ایک ماہ شکاگو میں رہی تھی۔

اسپیڈا جوف یانی وانسز کا شاگرد تھا اور انتہائی قابل بھی۔

اس سے میش اپ (مختلف گانوں کے ردھم سے تیار کیا گیا گانا) تیار کروانے کے لیے بیانکا نے اپنی باقی ماندہ دولت بھی خرچ کر ڈالی تھی اور فیصلہ قسمت اور وقت کے سپرد کر دیا تھا۔ ان دنوں وہ تقدیر کے پل صراط پر چل رہی تھی اور یہ پل صراط اسے ہر صورت طے کرنا تھا۔ تاہم کامیابی تک پہنچنے کے ممکنہ خدشوں کے باعث ابھی یہ نتیجہ زیادہ واضح نہیں تھا کہ اس نے اپنی باقی ماندہ دولت بہتر جگہ پر خرچ کی ہے یا آگ میں جھونک دی ہے۔

کچھ اس کی پچھلی آٹھ ماہ کی جاب کی مہارت تھی۔ کچھ اس مہارت پر ملنے والے کمنٹس اور کچھ اسپیڈا جوف کی بڑھتی ہوئی شہرت' وہ قدرے مطمئن تھی اور ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو لے کر پرامید بھی...

اس کے خیال میں میش اپ کے لیے 2014ء کے جن پانچ گانوں کا انتخاب اس نے کیا تھا اس کے بارے میں امریکہ کا کوئی ڈی جے سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے سولو اور سیڈ گانوں کا انتخاب کیا تھا۔ اپنی جاب کے دوران بھی وہ زیادہ تر افسردہ گانے چلانے میں ہی مہارت رکھتی تھی۔ پھر اس نے لبنانی سازوں کی نئی اور پرانی دھنوں کو بھی چنا تھا۔

اسپیڈا جوف کو اس کے سارے انتخاب پر اختلاف تھا۔

"ہر چیز میں افسردگی کا رنگ غالب ہے... میں اس

کے ساتھ ایسا کیا کروں کہ سب ناچنے پر مجبور ہو جائیں ....."

"تم اس بات کی فکر نہ کرو.... یہ میرا آٹھ ماہ کا تجربہ ہے۔"

"اور میرا دس سالہ .... گیت کو بہت زیادہ دھیما کر بھی دیا گیا تو اصل روح تو وہ ہی رہے گی۔"

اسپیڈا جوف کی بات میں دم اور تجربہ تھا.... لیکن بیانکا کچھ بھی ماننے کو تیار نہیں تھی۔

"دھنوں کے حوالے سے تم جو چاہے کر سکتے ہو.... لیکن گانے یہ ہی رہیں گے۔" اس نے دوٹوک اپنا فیصلہ سنا دیا۔

ایک ماہ لگاتار اس میش اپ پر کام ہوتا رہا تھا۔ وہ سازوں کے بارے میں اسپیڈا جوف سے زیادہ نہیں جانتی تھی۔ پھر بھی وہ تقریباً ہر روز اس کے اسٹوڈیو میں پہنچ جاتی تھی۔ تاہم یہ اس کی مہربانی ہوتی تھی کہ وہ صرف رائے ہی دیتی تھی.... مداخلت نہیں کرتی تھی۔

میش اپ تیار ہو چکا تھا۔ صرف ویڈیو مکسنگ کا کام ہو رہا تھا۔ بیانکا اسے کلب کی اینیورسری پر ریلیز کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

ساتھ ساتھ اس کی نظران جتنوں پر بھی تھی کہ میش اپ اعلیٰ سے اعلیٰ ہی کیوں نہ ہو' وہ ایک دم سے شہرت کی بلندیوں پر نہیں پہنچ سکتا۔ ایسا کسی سنگر کے ساتھ تو ہو سکتا ہے لیکن کسی ڈی جے کے ساتھ نہیں۔

ہاں البتہ یہ ضرور تھا کہ کوئی میوزک کمپنی اسے بڑی آفر کر سکتی تھی۔ کسی بڑے سیون اسٹار ہوٹل کے کلب میں جگہ پانے میں آسانی ہو سکتی تھی۔ یا وہ سیول ورلڈ ڈی جے فیسٹول میں جانے کی لمبی لائن میں کھڑے ہونے کے لیے اپنے پاس ایک ٹکٹ رکھتی تھی۔

اس کے اب تک پیچھے رہ جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ دوسری ڈی جے لڑکیوں کی طرح جھومتی ناچتی نہیں تھی۔ ایسے غیر اخلاقی کام کی سوچ بھی اس کی تربیت میں شامل نہیں تھی۔ مارٹا میں کسی حد تک دوسری ڈی جے لڑکیوں کے سے اثرات پائے جاتے تھے لیکن بیانکا نے جاب اسی شرط پر کی تھی وہ صرف میوزک چلائے گی.... اپنی جگہ ساکت رہ کر.... کلب انتظامیہ اس سے دوسری ڈی جے لڑکیوں کی طرح کا رویہ اپنانے کا مطالبہ نہیں کرے گی۔

کلب بہت زیادہ معروف نہیں تھا اور بیانکا کی شرائط بھی ایسی نامعقول نہیں تھیں۔

اس کے ان سخت اصولوں کے باوجود بھی اسے ادھر ادھر سے چھوٹی بڑی آفرز تو آتی ہی رہتی تھیں.... کسی ہوٹل یا کلب کی.... اور جن کو سن کر یارٹا اپنے چہرے کے بدلتے رنگوں پر قدرت نہ رکھ پائی تھی۔

"تم چاہتی کیا ہو بیانکا.... آخر تم اس آفر کو قبول کیوں نہیں کر لیتیں.... وہ تمہیں یہاں کی نسبت دوگنی تنخواہ دے رہے ہیں۔"

"مجھے ایک ہی بار میں بڑی چھلانگ لگانی ہے مارٹا .... تیراکی میں بٹو فلائی طریقہ مجھے شروع سے ہی ناپسند رہا ہے۔ انسان جلدی تھک جاتا ہے۔ مجھے ڈائیونگ (Diving) کا شوق ہے.... اونچی ڈائیونگ کا.... سمر سلٹ کا.... اور اس کا ابھی وقت نہیں آیا۔" مارٹا اس کی باتیں سن کر لاجواب ہو جاتی تھی۔

اور اب شاید وقت آگیا تھا بڑی چھلانگ لگانے کا۔

اس بڑی چھلانگ کی متوقع خوشی کو وہ کسی کے ساتھ شیئر کرنا چاہتی تھی۔ کسی کو اپنی بے تابی کا رازدار بنانا چاہتی تھی۔ کوئی ایک ایسا جو اسے بالکل اپنا لگے اور آنے والے وقت کے سہانے خواب اس کی آنکھوں میں پڑھ لے۔

تب وہ نہیں جانتی تھی کہ پڑھنے والا کوئی اور تحریر پڑھ لے گا اور بتانے والا بھی کچھ اور بتا دے گا۔

پتا نہیں یہ وجوہات اس کے ذہن میں تھیں یا شہرام کا نام یاد آتے ہی اس نے ان بہانوں کو گھڑ لیا تھا جو کچھ بھی تھا۔ آج وہ بلاارادہ اوک بلڈنگ تک نہیں جا رہی تھی۔ جہاں کے ایک نیم اندھیرے کمرے میں شہرام رہتا تھا۔

شکاگو جانے سے پہلے وہ اسی نیک کام کو کر کے گئی

تھی۔ اس نے ایک ماہ کا ایڈوانس کرایہ دیا تھا جس میں دو وقت کے کھانے کے چارجز بھی شامل تھے۔

"جب تم حالات کو اپنے لیے بہتر کر پاؤ تو ان پیسوں کو لوٹا دینا۔۔۔ نہ بھی دو گے تو کوئی مطالبہ نہیں کروں گی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ وہ بہت زیادہ پرجوش ہو رہی تھی۔

اس ایک ماہ کی غیر حاضری کے دوران اسے ٹوٹ کر یہ احساس ہوا تھا کہ شہرام کے پاس ایک سیل فون تو ہونا ہی چاہیے۔۔۔ وہ میک اپ کی تیاری کے سلسلے کی ہر بات اسے بتانا چاہتی تھی۔

"نجانے وہ اب تک اس بلڈنگ میں رہائش پذیر ہو گا یا کہیں اور جا چکا ہو گا۔" بیانکا کو یہ سوچ کر ایک خوف سا محسوس ہوا تھا۔

ٹیکسی بڑی سڑکوں کو ناپنے لگی تھی اور بیانکا کی نظریں افق کی دھار پر ٹکی ہوئی تھیں۔

دور۔۔۔ اوک بلڈنگ کے نیم اندھیرے کمرے میں بیٹھا ہوا شہرام بھی اسی طرح کی لایعنی سوچوں میں غرق تھا۔

"اس کمرے میں تو کوئی روزن بھی نہیں ہے۔۔۔ اور وہ لڑکی مجھے یہاں داخل کروا کر خود نجانے کہاں جا چھپی ہے۔"

وہ دو ایک بار شائن کلب بھی گیا تھا جہاں سے اسے صرف یہ ہی پتا چل سکا کہ بیانکا غیر معینہ مدت کے لیے کلب سے چھٹی لے چکی ہے۔

"تو کیا وہ لڑکی صرف ایک لمحے کی مدد تھی جو آیا اور چلا گیا۔"

وہ مایوسی سے سوچنے لگا تھا۔

دونوں نہیں جانتے تھے کہ دونوں آج ملیں گے تو ایک دوجے کو اپنے اپنے ماضی کی وہ پرتیں بھی دکھا دیں گے جن سے آپ ابھی تک لاعلم ہیں۔

☼ ☼ ☼

مغرب کی طرف کا شہیدی رنگ آسمان کسی قتل کی واردات کی کہانی سنا تا لگتا تھا۔

کھڑکی سے نظر آتی نیویارک شہر کی روشنیاں رفتہ رفتہ شباب کو پہنچنے والے جگنوؤں کی طرح دن ڈھل کے بیماری کے باعث گاڑھے ہوتے اندھیرے میں اپنی اپنی جگہ تلاش کر کے ٹمٹمانے لگی تھیں۔ دور سے یہ منظر کسی گڑھے میں پڑی پسی ہوئی چاندی کی طرح نظر آتا تھا۔

بیانکا نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے برابر کر دیے۔

حیفہ مام بڑی دیر سے باہر ہی دیکھ رہی تھیں۔ ایسے کہ ان کی آنکھیں جیسے اسی رخ پتھرا گئی ہوں۔ بیانکا نے ایک دو بار انہیں ٹوکا بھی تھا، لیکن وہ دوبارہ آنکھیں مسل کر باہر کے نظارے میں کھو جاتی تھیں۔ بیانکا کو ان کی اس حالت سے بڑا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے برابر کر دیے، لیکن حیفہ موم کی نظریں نہیں پھری تھیں۔ وہ باہر دیکھ رہی ہوتیں تو چونکتیں۔

"آج ڈیڈی کو زیادہ دیر نہیں ہو گئی۔۔۔"

کارنس پر دھرے کرسٹل گلدان میں پڑے نقلی پھولوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے اس نے مام سے کہا تھا۔۔۔ کسی حد تک خود سے۔۔۔

"دعا کرو انہیں صرف دیر ہی ہوئی ہو۔۔۔ دیر سے ہی سہی وہ آج گھر واپس آ جائیں۔" حیفہ مام نے رندھی ہوئی آواز سے کہا تو پھولوں کی ایک ڈنڈی بیانکا کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے فرش پر گر گئی۔ وہ حیفہ مام کی بات سے زیادہ ان کی غلافی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی کو دیکھ کر چونکی تھی۔ آج صبح سے ہی حیفہ مام کا انداز بہت عجیب اور نیا سا تھا۔ نمی نے ان کی آنکھوں کے کناروں کو اکیلا نہیں ہونے دیا تھا اور وہ ضرورت سے زیادہ خاموش تھیں۔۔۔ اور کئی گھنٹوں سے اسی کرسی پر بیٹھی تھیں۔

آج انہوں نے بیانکا کو تیز آواز میں میوزک سننے سے بھی منع نہیں کیا تھا۔ آج نہ ہی وہ اپنی دوستوں کے ساتھ گھر سے باہر گئیں اور نہ ہی ان کو اپنے گھر بلایا تھا۔

"مام.... سب خیریت تو ہے ناں...." وہ ایک بار پھر حیفہ موم کے قریب چلی آئی تھی۔

"خیریت....؟" وہ افسردگی سے چونکیں۔ "اسی کے لیے تو دعا کر رہی ہوں۔" ایک خاکستری آنسو ان کی آنکھ سے بہہ کر گال تک آ گیا۔

"آپ نے کبھی ایسا رویہ نہیں اپنایا مام.... آپ کبھی مجھے اتنی کمزور دل نہیں لگیں۔" فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا تھا۔ حیفہ مام اس کا سر سہلانے لگی تھیں۔

"کچھ واقعات زندگی میں پہلی بار ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں بیانکا...." انہوں نے دونوں آنکھوں کو باری باری اپنی شال سے صاف کیا تھا۔

"آپ جذباتی ہو رہی ہیں مام.... ڈیڈ آٹھ بجے تک آتے ہیں.... اور ابھی صرف آدھا گھنٹہ ہی تو زیادہ ہوا ہے۔"

"نو بج جائیں.... دس بج جائیں.... رات گزر جائے.... لیکن میرے دل کے خوف.... خدا کرے بس یہ پورے نہ ہوں۔"

"آپ بلاوجہ پریشان ہو رہی ہیں.... میں ڈیڈ کا فون پھر ٹرائی کرتی ہوں.... کسی وجہ سے ہی بند ہو گا.... ورنہ تایا غفار کو کر لیتی ہوں.... وہ بتا دیں گے کہ ڈیڈ وہاں سے کب نکلے تھے۔"

وہ اٹھنے لگی تو حیفہ موم نے اس کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر اسے دوبارہ نیچے بٹھا دیا تھا۔

"خدا کے لیے یہ مت کرو بیانکا.... کیا میں ایسا نہیں کر سکتی.... میں اپنی دعاؤں کو اور وقت کو مزید مہلت دینا چاہتی ہوں.... اگر فون تمہارے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا یا تمہاری آنکھوں کی پتلیاں ذرا سی بھی پھیلیں تو.... تو میرا دل اسی وقت بند ہو جائے گا۔"

حیفہ موم نے لرزش زدہ آواز سے کہا اور پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے لگی تھیں۔ بیانکا کا دل مٹھی میں آ گیا تھا۔

"ان سے پہلے ان کی خوشبو مجھ تک پہنچ جائے گی.... جو آج.... جو آج انہوں نے یہاں پہنچنا ہوا تو...." وہ روتے ہوئے گویا ہوئیں تو بیانکا نے چہرہ اٹھا کر پتھرائی آنکھوں سے انہیں دیکھا تھا۔

تب ہی نجانے کہاں سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اندر آیا تھا۔ جس کے انگ انگ میں کافور کی بو رچی بسی ہوئی تھی۔

الیاس کریم پچیس سال پہلے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں چھوٹی پوسٹ پر تعینات ہو کر پاکستان سے امریکہ آیا تھا۔ پاکستان کے شہر خانیوال میں اس کے خاندان میں دو بوڑھے ماں باپ ایک بڑے اور ایک چھوٹے بھائی کے علاوہ اس کی بچپن کی منگیتر شہناز بھی موجود تھی۔ شہناز الیاس کی چچا زاد تھی۔ جو چچا چچی کے انتقال کے بعد سے ان کے گھر ہی رہ رہی تھی۔ دونوں کی شادی دو سال بعد ہونا متوقع تھی۔ لیکن کون جانتا تھا کہ قسمت اور خود الیاس کریم کا منظور نظر کچھ اور ہی ہونے والا تھا۔

جس کمپنی میں الیاس کام کرتا تھا اسی کمپنی میں ایک سال پہلے حیفہ یازر بھی اپنی تعلیمی قابلیت اور ذہانت کی بنا پر ملازمت اختیار کیے ہوئے تھی۔

حیفہ یازر کا تعلق لبنان سے تھا۔ وہ بچپن سے ہی غربت اور بہت برے حالات میں پلی بڑھی تھی اور باپ کی وفات کے بعد ماں کو رشتے داروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر آئی تھی۔

الیاس کریم سے یہ ساری باتیں کرنے تک.... دونوں بہت اچھے دوست بن چکے تھے۔

حیفہ نوجوان تھی.... پرکشش بھی اس کے علاوہ اس کی آنکھوں میں بیشتر لبنانی لڑکیوں کی طرح قدرتی کاجل کی دہک نصب تھی۔ اور یہ قدرتی کاجل کی دہک وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ الیاس کو دن کے علاوہ راتوں کو بھی پریشان کرنے لگی تھی۔ وہ بھول گئے تھے کہ پاکستان میں ان کی نسبت شہناز سے طے ہے۔

حیفہ یازر کے متعلق سوچنے کی اخلاقی چوری نے رفتہ رفتہ الیاس کریم کا احساس جرم اتنا بڑھا دیا کہ پھر جلد ہی انہوں نے اس پریشانی کا مقابلہ کر لینے کی ٹھان لی۔

حیفہ یازر الیاس کے جذبات سے بہت دنوں تک غافل نہیں رہی۔ خود اس کے جذبات بھی کچھ اسی نوعیت کے تھے۔ لبنان میں بوڑھی ماں کی وفات کی خبر نے اسے مزید بے آسرا اور اکیلا کر دیا تھا۔ اس نے الیاس کو مشورہ دیا کہ وہ جلد ہی اپنے والدین کو دونوں کے فیصلے کے بارے میں آگاہ کریں۔

الیاس نے ایک دن ہمت کر کے اپنے والدین سے بات کی تھی اور انہیں حیفہ یازر کے متعلق بتایا تھا۔ اس بات چیت کا جو نتیجہ نکلا تھا' وہ الیاس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ دونوں نے انہیں خود سر' باغی اور نافرمان کا خطاب دیا تھا اور ان پر پاکستان واپس آنے کے لیے دباؤ ڈالا تھا۔

اس دن کے بعد الیاس نے وقفے وقفے سے ان کو منانے کی کوشش کی تھی اور فائدہ صرف اتنا ہوا تھا کہ ان کو ملنے والے خطابات روز بروز بڑھنے لگے تھے۔ حیفہ اس ساری صورت حال سے الگ پریشان تھی۔

پھر ایک دن الیاس نے پاکستان جا کر والدین کو منانے کا فیصلہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ فون پر وہ شاید اس کی مجبوری اور محبت کو صحیح طرح سمجھ نہیں پا رہے۔ شاید روبرو بات کرنے اور بھائیوں کے ساتھ کے بعد حالات مناسب رخ اختیار کر لیں' لیکن یہ ان کی خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔

پاکستان آنے کے بعد انہیں غضب ناک آواز کے ساتھ ساتھ نفرت انگیز تاثرات بھی دیکھنے کو ملے تھے۔ دونوں الیاس کے بچپن سے اب تک کے سارے احسانوں کی فہرست مرتب کیے بیٹھے تھے۔ اور انہیں جذباتی بلیک میل کرنے کا آخری حربہ آزما رہے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اس بات پر بھی بضد تھے کہ الیاس شہناز سے ابھی کہ ابھی شادی کر کے ہی واپس امریکہ جائیں۔

شہناز میں کوئی برائی نہیں تھی' لیکن یہاں معاملہ دل کا تھا جو پوری طرح حیفہ کی محبت میں ڈوب چکا تھا۔ الیاس نے اسی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ کیا جو ایسے موقعوں پر عموماً" لڑکے کرتے ہیں۔

رات کے ایک پہر انہوں نے اپنے گھر کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔

امریکہ واپس آکر انہوں نے حیفہ سے شادی کر لی۔ پاکستان سے ان کا ہر کسی سے ناتا ٹوٹ گیا تھا۔ سوائے سب سے چھوٹے بھائی جلال کے۔

دو سال بعد دونوں کے گھر بیٹی پیدا ہوئی تھی جس کا نام انہوں نے بیانکا (خالص سفید) رکھا تھا۔

تین سال بعد وہ دونوں اپنا گھر خریدنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور بہت خوش گوار زندگی گزار رہے تھے۔

اپنے آفس میں کام کے دوران الیاس کی نظروں سے زراعت کے شعبے میں حکومت کی غیر معمولی اور بڑھتی ہوئی دلچسپیوں کے منصوبے کے خاکے گزرے تو اسے اپنے چھوٹے بھائی جلال کریم کا خیال آیا تھا۔ جلال کی تعلیمی قابلیت اگرچہ الیاس جتنی نہیں تھی۔ لیکن زراعت میں اس کی مہارت غیر معمولی تھی۔ خصوصاً" دھان اور سورج مکھی کی فصلوں میں وہ کسی حکیم کا سا درجہ رکھتا تھا۔

الیاس نے جلال سے بات کی کہ وہ یہاں آکر اپنی قسمت آزمائے اور جلال دو ماہ بعد ہی امریکہ چلا آیا۔ یہاں جلد ہی اس کا کام بن گیا اور نیویارک سے تقریباً" چار گھنٹے کی مسافت پر (کنیٹکی کٹ) میں اسے ایک جاب مل گئی۔

ایک سال بعد جلال نے اپنے بڑے بھائی غفار اور اپنی بیوی فیروزہ کو بھی پاکستان سے امریکہ بلا لیا تھا۔ غفار کی شادی الیاس کے گھر چھوڑ کر جانے کے بعد شہناز سے کر دی گئی تھی۔ الیاس ان دنوں بہت خوش تھے' ناراضگی اور لاتعلقی کی برف رفتہ رفتہ پگھلنے لگی تھی۔

دو سال بعد شہناز اپنے بڑے بیٹے احمد کے ساتھ اکیلی امریکہ نہیں آئی تھی۔ بلکہ اس کے ساتھ الیاس کے والدین بھی تھے۔ الیاس نے ان سے معافی مانگنے میں پھر دیر نہیں کی۔۔۔ دونوں نے اسے معاف کر دیا تھا۔ اور تعلقات کافی استوار ہو چکے تھے۔

پھر باپ کی وفات کے چند ماہ بعد ہی ماں کی وفات

نے گویا ہر طرح کی رنجش ہی ختم کردی۔
تب سے الیاس کا یہ معمول تھا کہ وہ ہفتے دو ہفتے بعد ایک دو دن اپنے بھائیوں اور بھابھیوں کے ساتھ گزارہ کرتے تھے، کنیٹکٹ کے مضافات میں سورج مکھی کے کھیتوں کے درمیان ایگر یکلچر اتھارٹی کی طرف سے ملا ہوا ایک بہت بڑا گھر تھا جہاں اس کے بھائی اپنی بیویوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔۔۔۔ غفار اور شہناز کا صرف ایک بیٹا تھا۔۔۔ احمد، جبکہ جلال اور فیروزہ شادی کے بائیس سال بعد تک بے اولاد تھے۔
حیفہ بھی اکثر الیاس کے ساتھ وہاں جاتی تھی، لیکن نجانے کیا بات تھی حیفہ ان سے زیادہ بے تکلفی پیدا نہیں کر سکی تھی اور اس معاملے میں وہ ان لوگوں کو ہی مورد الزام ٹھہراتی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنے قیمتی مشورے سے جلال اور فیروزہ کو بارہا نواز چکی تھی کہ وہ کوئی بے بی اڈاپٹ کرلیں، لیکن اس معاملے میں ان کی پرانی قدریں آڑے آجاتی تھیں۔
الیاس کا آج کا بھائیوں کی طرف جانا بھی اس کے پرانے معمول کا ہی حصہ تھا۔ سیل فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور حیفہ مام اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھیں۔ انہیں اطلاعی گھنٹی کے بجنے کا انتظار تھا اور سیل فون کی بجتی گھنٹی نے ان کے ٹوٹ چکے اعصاب پر گویا گورکن کا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ان کی چھٹی حس بھی گھنٹی کے ساتھ ساتھ بڑے خطرناک انداز میں جھنجھنا رہی تھی۔
بیانکا نے ہی فون ریسیو کیا تھا۔
"ہیلو۔۔۔ حیفہ بھابھی۔" چچا جلال کی آواز آئی تھی۔
"نہیں چچا۔۔۔ میں بیانکا بات کر رہی ہوں۔"
"بیانکا! حیفہ کہاں ہے؟۔۔۔ رہنے دو۔۔۔ اسے نہ بلاؤ۔۔۔ میں، میں بیانکا میری بات غور سے سنو بیٹی! ذرا تحمل اور حوصلے کے ساتھ۔"
"کیا بات ہے چچا۔۔۔؟"
بیانکا کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اس نے اپنی آواز کو دھیما کرلیا تاکہ حیفہ مام نہ سن پائیں اور رخ بدل لیا کہ وہ اسے دیکھ بھی نہ سکیں۔
"بیانکا۔۔۔ بیانکا بیٹی۔۔۔ دراصل۔۔۔ خدا کے لیے پہلے تم کہیں بیٹھ جاؤ۔۔۔ دراصل بات یہ ہے کہ الیاس بھائی کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔۔۔ تم پریشان مت ہونا۔۔۔ غفار بھائی اور احمد انہیں ہسپتال لے کر گئے ہیں۔۔۔ تم ایسا کرو۔۔۔ تم اور حیفہ بھابھی یہاں ہی آجاؤ۔۔۔ الیاس بھائی کی صحت کے بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔۔۔ ہم تو بس دعا ہی کر سکتے ہیں۔۔۔ تم سن رہی ہو نا بیانکا۔۔۔ تم دونوں جلدی یہاں پہنچو۔۔۔ بیانکا تم مجھے سن رہی ہو نا بیانکا۔۔۔ بیانکا۔۔۔ بیانکا۔"
اوندھے ہوئے موبائل سے نکلتی چچا جلال کی آواز چوبی فرش سے ٹکرا کر بڑی دہشت ناک صورت حال اختیار کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

البانیہ کا شہر ارجیر۔۔۔
ارجیر کی جنگلی درختوں والی پہاڑی سرد ہواؤں نے اسے کسی بچے کی طرح گود میں اٹھا کر بھرپور بوسہ دیا تھا۔ ساڑھے تین سال کی لمبی غیر حاضری کے عرصہ نے اس بوسے کو بے پناہ مختصر اور طویل کر دیا تھا۔
وہ بینسٹن یونیورسٹی (نیوجرسی) میں قیام کے ساڑھے تین سال بعد ارجیر واپس لوٹا تھا۔ اس کے مستقل طور پر امریکہ سے البانیہ آجانے میں ابھی مزید چھ ماہ کا عرصہ درکار تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی پندرہ روزہ ہنگامی چھٹیوں نے اسے اچانک البانیہ کا دورہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نجانے اسے اماں زیتونیہ کی یاد یہاں کھینچ لائی تھی یا بابا زلاری کی 'سیرین' طامیر یا حسنی کی۔۔۔ اس بات کا فیصلہ کرنا قریب قریب ناممکن تھا۔ ان سارے عوامل نے مل کر اس کے ذہن پر دباؤ ڈالا تھا اور وہ سب کو حیران اور خود کو خوش کرنے البانیہ پہنچ گیا تھا۔
ٹیکسی سے اتر کر اس نے ایک طویل اور خوشگوار سانس اندر کھینچا تھا۔ جنگلی درختوں سے ٹکرا کر آتی ہوا میں خون کو مصفیٰ۔۔۔ کر دینے کی طاقت تھی۔ اس

گھرے سانس نے اس کی سفر کی ساری تھکن کو پلک جھپکتے میں دور کر دیا۔ وہ ہر ہر درخت اور پتے کی خوشبو کو اپنی اندر کھینچ لینا چاہتا تھا۔ درختوں سے محبت کرنا اسے بابا زلاری نے سکھایا تھا اور وہ اس شاگردی میں اتنا طاق رہا تھا کہ درختوں سمیت انسانی تعلق کے ہر معاملے میں بھی محبوب بننے کو ترجیح دیا کرتا تھا۔

ٹیکسی اس نے اپنے گھر سے بہت پیچھے اور نیچے ہی رکوالی تھی۔ راستے میں اسے بہت سے لوگوں سے ملنا تھا۔ اپنے دیرینہ دوست طامیر سے ”منگیتر سیرین سے اور..... اور ”کدام“ کے درخت سے بھی.....

مسکراہٹ اس کے لبوں پر گل صد برگ کی طرح کھلی ہوئی تھی۔

اس نے تینوں منزلوں کو ملانے والی پگڈنڈی پر چلنا شروع کر دیا۔ یہاں سے ارجیر مال (فوڈ سٹریٹ) تک کا راستہ تقریباً“ دو کلومیٹر تھا اور دو کلومیٹر کی یہ چڑھائی آج کسی صورت اسے تھکا نہیں سکتی تھی۔ اس نے زمین کی کشش کی ہم نوائی اور مہمانی کو قبول کیا اور چڑھنا شروع کر دیا۔

ساڑھے تین سالوں نے ارجیر پر زیادہ نمایاں اثرات مرتب نہ کیے تھے۔ کچھ تعمیرات نئی ہوئی تھیں۔ کچھ ہوٹل گھر اور درخت مزید اونچے ہو گئے تھے۔ چند ایک نئی پگڈنڈیوں نے جنم لیا تھا۔ اور راہ میں پڑنے والے جھرنے سکڑاؤ کا شکار ہوئے تھے۔

اوپر چڑھتے چڑھتے وہ سوچنے لگا کہ ان گم شدہ سالوں نے اس کے چاہنے والوں پر کیا کیا اثرات مرتب کیے ہوں گے۔

طامیر کی داڑھی کے بال یقیناً مکمل طور پر آ چکے ہوں گے۔ عالم شباب سے ہی اس کے چہرے پر بالوں کی تعداد خاصی کم تھی۔ اسی وجہ سے دونوں کے مشترکہ دوست اسے لڑکی لڑکی کہہ کر چھیڑتے تھے۔ تنگ آ کر طامیر نے چپکے چپکے بہت سے ٹوٹکوں کو آزمانا شروع کر دیا تھا۔ خصوصاً“ چہرے پر انڈے کی زردی لگانے والے عمل کو تو وہ تقریباً“ روز ہی کیا کرتا تھا۔

اور سیرین..... اس کی چھپتیل ہرن کی سی کرنجی آنکھوں میں بھسم کر دینے کی طاقت کیا کیا نہ ٹھاٹھیں مارتی ہو گی اور اس کے گال جو پہلے ہی دہکتے ہوئے لگتے تھے۔ اب تو انہوں نے آگ ہی پکڑلی ہو گی۔

اپنے تخیل میں کچھ سوچ کر وہ مسکرایا اور اس طرح مسکرایا کہ پرواز کرنے والے پرندے رک کر اسے دیکھنے لگے اور ولائی (طرز مخاطب) حسنی..... سنجیدہ..... بردبار اور کم گو..... شاید ان کے چہرے کے چوب دار تاثرات میں کچھ لچک آگئی ہو۔

اس کے پیروں کے نیچے مرجھائے سوکھے پتوں کے ڈھیر آ کر چرمرانے لگے تھے۔

اماں زیتوبیہ..... اور بابا زلاری..... جو ہر وقت ”سان“ اور ”سکی“ کے لقب کو لے کر نوک جھونک کیا کرتے تھے یا تو یہ القاب بھول گئے ہوں گے یا ان کو لے کر دونوں میں باقاعدہ زبردست قسم کی لڑائی ہوتی ہو گی۔

اس نے پشت پر لٹکتے سفری بیگ کو دائیں کندھے سے اتار کر بائیں کندھے پر ڈالا..... بوجھ زیادہ تھا اور اس کی تمام تر خوشی کے آگے ہیچ بھی..... اس نے رک کر اوپر تک جاتی پگڈنڈی پر نظر ڈالی..... دھوپ میں بدلتی چھاؤں سارے راستے واضح کرنے لگی تھی۔

شہرام کے والدین کا ارجیر مال پر ایک وسیع و عریض ریسٹورنٹ تھا۔ جس کا کافی حصہ اس باغ پر مشتمل تھا جس سے قلہ (پہاڑ کی چوٹی) اور جھرنے کی خوب صورتی کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

لیکن یہ ریسٹورنٹ صرف اپنی خوب صورتی کی وجہ سے مشہور نہیں تھا‘ بلکہ اس کے کھانوں کی شہرت اس کی خوب صورتی سے کہیں زیادہ تباہ کن تھی۔ ریسٹورنٹ میں باربی کیو کی تو تقریباً“ ہر ہی قسم فراہم کی جاتی تھی۔

اماں زیتوبیہ اپنے رعب‘ قابلیت اور تجربے کی بنا پر اس ریسٹورنٹ کی ہیڈ تھیں۔ باقی معاملات میں کچھ لچک سہی‘ لیکن گرل (بھٹی) پر کھڑے ہونے کی اجازت کسی ملازم کو کیا خود بابا زلاری تک کو نہیں تھی۔ وہ پچھلے بیس سالوں سے باربی کیو کر رہی تھیں

اور صرف وہ ہی کر رہی تھیں۔ ان کے پکائے کبابوں' بنا تیل کے بنی مچھلی اور تندور میں پکی چپاتیوں کی شہرت ارجیرکی فضاؤں کو پار کرکے البانیہ کے دوسرے شہروں تک پھیلی ہوئی تھی۔

تھکاوٹ اور بیماری کو تو کوئی اہمیت ہی نہ دی جاتی اور اگر کوئی خاص مجبوری آ بھی جاتی تو گرل کسی ملازم یا بابا زلاری کے حوالے کرنے کے بجائے ریسٹورنٹ کو ہی بند کر دیا جاتا۔ اماں زیتوبیہ اپنے اصولوں میں کھجور کے درخت کی طرح سخت اور کھردری تھیں۔ وہ اس معاملے میں بابا زلاری پر بھی اعتماد نہ کرتی تھیں۔

"جس سان (بڑے اوزار تیز کرنے کا پتھر) پر تم ٹوکے چھریاں تیز کرتے ہو' اس کا وار میری محنت پر کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہارا کام مسالے پیسنا' گوشت کاٹنا اور میزبانی کرنا ہے۔ کیا میں نے کبھی تمہارے کاموں میں دخل دیا۔ میرے ہوتے ہوئے گرل پر کوئی کھڑا نہیں ہوگا۔" اماں زیتوبیہ فیصلہ کن لہجے میں کہہ دیتیں۔

بابا زلاری اچھی طرح جانتے تھے کہ کسی چٹان کو تو کھسکایا جاسکتا ہے' لیکن اماں زیتوبیہ کو ان کے فیصلے سے ہرگز نہیں... لیکن پھر بھی انہیں اماں زیتوبیہ کو چڑانے میں ایک خاص لطف آتا تھا۔

"تم سمجھتی ہو' تم کامل ہو... دنیا میں ہزاروں' لاکھوں جگہ پر گرلنگ ہو رہی ہے اور وہ سب تم سے کہیں زیادہ بہتر کر رہے ہوں گے۔ تمہیں گھمنڈ ہے کہ کوئی تمہارے جیسی کر ہی نہیں سکتا۔"

"ہاں... مجھے یہ ہی گھمنڈ ہے... میں لمحے بھر کے لیے رسک نہیں لے سکتی۔ کوئی اور یا تو کبابوں کو جلا دے گا یا کچا رہنے دے گا۔ میری برسوں کی محنت رائیگاں چلی جائے گی اور برسوں کے خوش باش گاہک ناراض ہونے لگیں گے۔ ہم میں سے میرے علاوہ کوئی اور یہ کام نہیں کرسکتا... خاص کر تم زلاری...."

اماں زیتوبیہ بھی بابا کو چڑاتیں... وہ طنز کرنے کے لیے ہر وقت موقع کی تاک میں رہا کرتی تھیں۔

پھر ایک واقعہ ایسا ہوا' جس نے بابا زلاری کو گویا نہال ہی کر دیا۔

مال کو پر رونق اور سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنانے کے لیے حکومت نے کچھ ترقیاتی کاموں کا آغاز کیا تھا۔ وسیع مال پر اپنے اپنے نام کے جھنڈے گاڑنے کے لیے دو مشروب ساز کمپنیوں میں کھینچا تانی چل رہی تھی۔ اماں زیتوبیہ نے ایک کمپنی کی آفر کو رد کرکے دوسری کمپنی سے دوگنی قیمت پر پانچ سال کا کنٹریکٹ کیا تھا۔ نادانی اور کسی حد تک بے وقوفی میں کیا گیا یہ کنٹریکٹ ایک ایسی غلطی ثابت ہوا جس کا اندازہ انہیں وقت گزرنے کے ساتھ ہوا تھا۔ نیون سائن کو روشن رکھنے کے علاوہ پہلی کمپنی ریسٹورنٹ کے پینٹ کے لیے بھی ہر چھ ماہ بعد معقول رقم دینے والی تھی اور ان کا کنٹریکٹ رقبے کے لحاظ سے تھا۔ دوسری کمپنی سے ملی دوگنی قیمت پہلی کمپنی کی مجموعی رقم کا چوتھا حصہ بھی نہ تھی۔

شرمندہ شرمندہ اماں زیتوبیہ چاہتی تھیں کہ یہ باتیں کسی بھی طرح بابا زلاری تک نہ پہنچیں پر ایسا ہو کر رہا۔

اماں زیتوبیہ کے علاوہ گھر کے باقی افراد اس دن ساری رات ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتے رہے۔

"قصور اس کا بھی نہیں... یہ سلی (اوزار تیز کرنے کی چھوٹی پتھری) ہے نہ... چھوٹے وار کرنے والی... عورت بڑے وار کرنے کا سوچ تو سکتی ہے' لیکن بے چاری کر نہیں سکتی... اس کی حیثیت ہی ادنیٰ ہوتی ہے... دنیا کی ساری عورتیں ہی سلیاں ہیں... بے وقوفی کی انتہا پر پہنچی ہوئی۔ صرف مرد ہی سان ہوتا ہے۔ بڑے وار کرنے والا' ایک ہی وار میں چت کر جانے والا۔"

"اچھا... اب بس کرو۔"

بابا زلاری کے ہاتھ قسمت سے جو موقع آیا تھا' وہ اس کا بھرپور فائدہ اٹھا رہے تھے اور اماں زیتوبیہ کی برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔

"عورت کسی قابل ہوتی تو دنیا کی جنگوں میں اس کا بھی نام ہوتا... لیکن تمہاری ماں کو کیا ہوا... یہ تو خود کو

سارے جہان کے مردوں سے زیادہ عقل منداور ذہین و فطین سمجھتی تھی۔"

بابا زلاری کا لیکچر ختم نہیں ہو رہا تھا۔ غصے سے اماں زیتو بیہ کا چہرہ لال ٹماٹر ہو گیا تھا۔ جسے دیکھ دیکھ کر شہرام اور ولائی حسنی کی ہنسی نہ تھمنے میں آتی تھی۔

اس دن کے بعد دونوں کے لقب "سان اور سلی" ہو کر رہ گئے تھے۔

اور ان القاب پر جس جس طرح کی لڑائی ہوئی تھی وہ کچھ کچھ صلیبی جنگوں سے ملتی جلتی تھی۔

چلتے چلتے شہرام کدام کے گھنے سایہ دار درخت کے قریب آ گیا تھا۔

یہ درخت اسے اپنے بچپن سے ہی دیودار اور صنوبر کے درختوں کے جھرمٹ میں کھڑا بڑا عجیب فسوں خیز لگتا تھا۔ جیسے اس کی قلم کسی چیتان سے آئی ہو یا اس کی۔ آبیاری کسی برگزیدہ ہستی نے کی ہو۔

شہرام اور سیرین کے بیشتر موسم اسی درخت کے حدود اربعہ میں گزرے تھے۔

بیضوی سنگی ٹیلے پر چڑھ کر وہ شاخ تلاش کرنے میں شہرام کو زیادہ وقت نہیں لگا، جس پر اس نے چار گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد ایک گلاب کا پھول ابھارا تھا۔ پھول ابھی بھی ویسا ہی تھا۔ کوئی پتی پھیلی ہوئی یا ٹوٹی ہوئی نہیں تھی۔ البتہ رنگ پر کائی کی دبیز تہ چڑھ گئی تھی جو ٹھہرے ہوئے پانیوں کا مقدر ہوتی ہے۔

پھول کو جی بھر کر دیکھ لینے کے بعد وہ آگے بڑھ گیا۔

بابا زلاری اپنے روزمرہ کے کاموں کے علاوہ لکڑی پر مصوری کرنے کا شوق بھی رکھتے تھے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر یہ شوق کسی حد تک شہرام میں بھی منتقل ہو گیا تھا۔

ایک دوپہر وہ گھر سے بابا زلاری کے سارے اوزار اٹھا لایا تھا، اور کدام کی ایک موٹی شاخ پر گلاب کا پھول کاڑھنے کے لیے اس نے اپنی ساری توانائی اور تخلیقی قوت صرف کر دی تھی۔ وہ محض لکیریں نہیں تھیں۔ بلکہ شاخ سے پھوٹتا کوئی اصلی پھول معلوم ہوتا تھا۔

قریب ہی سیرین بھی کچھ بنانے میں مشغول رہی تھی۔

جب شہرام کا پھول ابھر آیا تو اس نے سیرن کی بنائی شبیہ پر توجہ دی تھی۔ وہ لالے کا پھول تھا۔ ناگواری کا ایک احساس شہرام کو چھو کر گزر گیا۔

"مانا کہ میں تمہارے جتنی ماہر نہیں ہوں۔ مگر پھول اتنا بھی برا نہیں بنا کہ تم میری حوصلہ افزائی نہ کر سکو۔"

وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ایسے میں اس کی آنکھوں کی چمک دوچند ہو جاتی تھی اور شہرام اس کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ اور دیکھنا بھول جاتا تھا۔

"تم نے لالے کا پھول کیوں بنایا؟"

"کیونکہ یہ مجھے پسند ہے۔"

"کیا تمہیں نہیں پتا کہ لالہ گلاب کا رقیب ہے؟"

شہرام نے سنجیدہ لہجہ اپناتے ہوئے کہا تھا اور سیرین قہقہہ لگا کر ہنسی تھی۔ شہرام سب کچھ بھول کر وقتی طور پر خود کو اس دنیا کا بادشاہ سمجھنے لگا تھا۔

"یہ باتیں شاعری اور افسانوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ سائنس اور حقیقت پر بھروسا کرنا سیکھو۔"

"پھر بھی تمہیں کچھ اور بنانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔"

"اگلی بار تمہاری نصیحت پر عمل کروں گی..... اب چلو کافی دیر ہو گئی ہے۔" وہ شہرام کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگی۔ شہرام تھکے قدموں سے اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔ نظر انداز کر دینے کے باوجود گلاب کے پھول کے ساتھ لالے کے پھول کا منظر اس کی شعور کی آنکھ سے ہٹتا ہی نہیں تھا۔ اس نے اس منظر کو بد شگون جانا تھا۔

دو ماہ بعد جب دونوں کی منگنی اس دھوم دھام سے ہوئی کہ پورا ارجیر حیران رہ گیا تو اس کے تمام منفی خیالات اور وسوسے خود بخود ہی ختم ہو گئے تھے۔

پگڈنڈی نے ایک جگہ کھلے احاطے کی صورت اختیار کر لی تو وہ رک گیا۔ طامیر کے گھر کا کھلا دروازہ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ اس نے کھلے دروازے کے ایک پٹ میں منہ ڈال کر اندر دیکھا۔

مخملی روئیں دار سفید پروں والے رومالی کبوتروں کا غول تھا جو دہلیز کے آگے سے صحن میں چاروں طرف

بکھرے دانے کو چگتے ہوئے غٹرغوں غٹرغوں کر رہا تھا۔ معاً چند کبوتروں نے شہرام کے چہرے کو دیکھ لیا اور ایک اجنبی کو دیکھ کر خوف سے ان کی غٹرغوں مزید بلند ہو گئی۔

طامیر وسیع صحن کے درمیان اسٹول پر بیٹھا کبوتروں کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ شہرام نے ایک قدم اندر رکھا تو دہلیز کے قریب بیٹھے کبوتر اڑ کر دور چلے گئے۔ طامیر نے سر اٹھایا تھا۔

"شہرام...!" شہرام کو دیکھ کر طامیر گویا سکتے میں جا کر بری طرح چونکا تھا۔ "شہرام میرے دوست... اس طرح اچانک..."

وہ اس بے خودی سے اٹھا کہ گود میں دھری باجرے کی تھالی زمین پر لڑھک گئی اور اس کے تیز قدموں کے باعث کبوتروں کا سارا غول اڑ کر آسمان کی طرف نکل گیا۔

طامیر نے دیوانہ ہو کر شہرام کو چوم ڈالا اور بازوؤں میں کس کے کچھ اس طرح پکڑا کہ شہرام زمین سے دو انچ اوپر اٹھ گیا۔

"آ... ہائے..." شہرام کے منہ سے آہ نکل گئی تو طامیر ہنسنے لگا۔ اس نے اسے واپس زمین پر چھوڑا۔

"مجھے پہلے کیوں نہ اطلاع کی... اتنی دور سے آمد کا پروگرام اچانک نہیں بن سکتا... میں تجھے لینے ایئر پورٹ آتا۔"

"میں بتا کر آتا تو یہ منظر بھلا کب دیکھنے کو ملتا۔" شہرام نے گرے ہوئے باجرے کی طرف اشارہ کیا تو طامیر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

"سامان تو اتار کندھے سے... اندر بیٹھ... کتنے دنوں کے لیے آیا ہے... خدایا کتنی باتیں ہیں تجھ سے کرنے والی... نہ جانے ان دنوں میں ہو بھی سکیں گی کہ نہیں۔" وہ اس کے کندھے سے سامان اتارنے لگا۔

"بیٹھوں گا، مگر ابھی نہیں... ابھی مجھے اوپر (پہاڑ کے اوپر) جانا ہے... امی ابو سے ملنا ہے... یہ بیگ بھی پکڑ لے... میرے تو ہاتھ درد کرنے لگے ہیں... آنٹی کہاں ہیں۔"

"امی بازار گئی ہیں... تو تھک گیا ہو گا... تھوڑی دیر بیٹھ جا... کبوتروں کے واپس آنے کا انتظار کر لیتے ہیں۔"

"نہیں میں بالکل نہیں تھکا... بیٹھ گیا تو یقیناً آرام کرنے کا دل کرے۔"

"اچھا۔ پھر مجھے تالا ڈھونڈنے دے۔ اماں پتا نہیں ایسی چیزوں کو کہاں رکھتی ہیں۔"

"نہیں مل رہا تو رہنے دے... تالے کی ایسی کیا ضرورت ہے۔"

"نہیں یار۔ ارچیر میں پچھلے کئی ماہ سے بہت سی وارداتیں ہونے لگی ہیں۔ کیا خالہ زہتو بیہ کو بھی نہیں پتا تیرے آنے کا۔"

"نہیں انہیں بھی نہیں پتا... کیسی وارداتیں ہونے لگی ہیں۔"

واپس باہر آتے ہوئے شہرام نے پوچھا تھا۔ طامیر لمحے بھر کو چپ ہو گیا تھا۔

"بس ویسی ہی جیسی دنیا کے باقی حصوں میں ہوتی ہیں۔ کچھ دستوری... کچھ قلبی... ان وارداتوں پر زیادہ حیران نہیں ہونا چاہیے... تجھے ایک فون تو کرنا چاہیے تھا۔" طامیر نے بات کا موضوع بدلا۔

پشت پر طامیر کا گھر ایک دھبے کی صورت اختیار کرنے لگا تھا۔ دونوں کافی آگے بڑھ گئے، تو پگڈنڈی کے ایک ایسے موڑ پر جہاں پگڈنڈی دوشاخہ ہو جاتی تھی۔ شہرام نے طامیر کو کراس کیا تھا۔

"یہاں کہاں... ہمیں تو اوپر جانا ہے۔" طامیر نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"ہاں... پر پہلے مجھے سیرین سے ملنا ہے۔"

"بعد میں مل لینا۔"

"حرج ہی کیا ہے... صرف چند منٹ ہی تو زیادہ کا سفر ہے۔"

شہرام چلنے لگا اور ایک بات اس نے واضح طور پر نوٹ کی کہ سیرین کا نام لینے پر طامیر کے چہرے پر بڑی کٹھور سی سختی در آئی تھی۔ اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ طامیر نے اس کٹھور سختی کو چھپانے کی کوشش

بھی نہیں کی تھی۔ شہرام نے اسے وقتی رویہ جان کر نظر انداز کر دیا تھا۔ ورنہ طامیر یہ بات بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ دنیا میں اگر شہرام کے لیے کوئی جنت تھی تو اس جنت کا نام بلاشبہ سیرین ہی تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کے پر رفتہ رفتہ سلگنے لگے تھے اور دھواں تھا کہ سارے منظروں کو اودی پر چھائیوں سے ڈھکتا جا رہا تھا۔

وقت کی سانسوں میں بند قبر کی سی وحشت تھی۔ چیزیں اپنے وجود کے ساتھ موجود تو نظر آتی تھیں، لیکن نزع کے کرب میں مبتلا لمحہ بہ لمحہ مرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

وہ چار گھنٹوں کا سفر مختصر نہیں ہوتا تھا۔ اس چار گھنٹے کے سفر میں چار صدیاں سرائیت کر گئی تھیں اور بیانکا کی عمر اتنی نہیں تھی۔ اس لیے وہ مر مر کر دوبارہ زندہ ہو رہی تھی۔ اس بار بار مرن جیون کے کھیل نے اسے ہلکان کر کے ادھ موا کر دیا تھا۔

دعا مانگنے کے لیے وقت بہت زیادہ تھا، لیکن قبولیت کے لیے شاید بہت کم۔ کچھ فضا میں موت کی باس اس طور پھیلی تھی کہ دعا صرف لبوں سے ادا ہوتی تھی۔ دل اس دعا کے ساتھ نہیں دھڑکتا تھا۔

پھر سفر کے اختتام پر جو منظر ان کے سامنے تھا وہ تخیلاتی طور پر ناقابل یقین سہی۔ لیکن تصوراتی حس کی توقع کے عین مطابق تھا۔

بیانکا کو یاد نہیں تھا کہ وہ اپنے بچپن سے لے کر اب تک کبھی روئی بھی تھی۔ اسے تو صحیح طرح سے رونا بھی نہیں آتا تھا، لیکن رونے کا عمل اچانک پھوٹ پڑنے والے آتش فشاں کی طرح ہوتا ہے۔ اسے سیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کے لیے کوئی استعارہ درکار نہیں ہوتا۔ ماں کی کوکھ میں ہی یہ بیراگ انسان کے وجود میں شامل کر دیا جاتا ہے۔

وہ غم زدہ ہو کر اتنا روئی تھی اور شوریدہ سری میں اتنا چلائی تھی کہ حیفہ مام اپنا غم بھول کر اسے سنبھالنے لگی تھیں۔ اسے کسی طور یقین نہیں آتا تھا کہ وہ اب کبھی اپنے ڈیڈ الیاس کو نہیں دیکھ سکے گی۔ لمحوں میں پہلی بار وہ بچی سے بڑی ہو گئی تھی اور جب اسے اس بات کا یقین ہو گیا تو وہ تڑپ تڑپ کر یہ دعا کرنے لگی کہ یہ آخری دیدار اس کی پوری زندگی پر اپنی وسعتیں پھیلا دے۔ وہ ساری زندگی اس تخت کے سرہانے بیٹھی رہنے کو تیار تھی جس پر ڈیڈ الیاس کی میت پڑی ہوئی تھی۔ وہ وہیں مجسم ہو جاتی۔ وہیں میخ جاتی اگر میت اٹھانے کے لیے لوگ نہ اندر آ جاتے۔

حیفہ مام اپنے ساتھ ساتھ اس کے آنسو بھی صاف کر رہی تھیں۔ انہیں خود کے ساتھ اسے بھی سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ وہ دہرے غم سے گزر رہی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ بیانکا کی آنکھوں میں آنسوؤں کے علاوہ ایک سنگریزہ بھی قید ہے۔ جو اس کی آنکھوں میں کب سے بری طرح چبھ رہا ہے۔

ڈیڈ الیاس کی گردن کے نیچے ایک گہرے سرخ ابھار کی لمبی سی دھار تھی۔ جو بالکل تازہ لگتی تھی۔ یہ دھار کسی چوٹ کی نہیں تھی.... بلکہ کسی پوشیدہ خفیہ بیماری کی طرف اشارہ کرتی تھی۔

شاید انہیں علم ہو گیا تھا کہ وہ اب زیادہ دیر زندہ نہیں رہ پائیں گے۔ تب ہی چند ماہ پہلے انہوں نے اپنے سارے اثاثے بیانکا کے نام منتقل کر دیے تھے۔ وہ اس پریشانی کے عذاب میں خود کیوں جلتے رہے۔ انہوں نے ہمیں کیوں نہ بتایا۔

روتے ہوئے بیانکا کو اپنے ڈیڈ الیاس سے شکوہ ہوا تھا۔ حیفہ مام کے آنسوؤں کا بند قبرستان سے واپسی پر ٹوٹا تھا۔ پچیس سال بعد وہ ایک بار پھر کسی مہاجر کی طرح لق و دق صحرا میں اکیلی رہ گئی تھیں۔ کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی بانگ درا کو انہوں نے نہیں سنا تھا اور نقش پا ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے تھے۔

اب کوئی الیاس ان کی رہنمائی کرنے کے لیے موجود نہیں تھا۔ چچا جلال نے انہیں اپنے گھر مزید کچھ وقت گزارنے کے لیے کہا تھا، لیکن دونوں تین چار دن بعد نیویارک واپس آ گئی تھیں۔

زندگی کے کچھ زخم ایور گرین پودے کی طرح ہوتے ہیں۔ ہمارے دکھ، رنج، سوچوں اور مردہ جذبوں کے پانی کی آبشار ہمیشہ انہیں بھگوئے رکھتی ہے اور زخم ہمیشہ تازہ رہتے ہیں۔

یہ زخم جو رستے رہتے ہیں اور کبھی نہیں بھرتے۔

ان زخموں پر وقت کا دیوہیکل گھڑیال بھی شرمسار ہوتا ہے۔

"اب ہم جلد ہی اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوجائیں گے بیانکا... اس گھر کی وسعت میں اب میرا دل گھبرائے گا۔" گھر آتے ساتھ ہی حیفہ مام نے بیانکا سے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے مام... جیسے آپ مناسب سمجھیں۔"

آنے والے وقت میں حیفہ مام نے اپنے بازوؤں کے حصار کو چھوٹا ہوتا پایا۔ ہر چیز ان کے ہاتھوں سے نکلنے لگی تھی۔ ان میں اب اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ ہر معاملے کی الیاس کی طرح دیکھ بھال کریں۔ کچھ پراپرٹی تھی جس کا رینٹ ضرورت سے بہت زیادہ تھا۔ الیاس کے بعد زندگی ویسی ہی پرآسائش ضرور تھی، لیکن تنہائی کا شکار بھی ہوچکی تھی۔

وہ الیاس کریم کی وفات کے تقریباً" ایک ماہ بعد کا دن تھا۔ جب ان دونوں نے اپنا سارا سامان بند کارٹنوں میں پیک کرکے اپارٹمنٹ منتقل کیا تھا اور اسی دن چچا جلال کا فون آیا تھا۔ انہوں نے اپنے گھر آنے کے لیے کہا تھا۔

"حیفہ! مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے... بیانکا کو بھی ساتھ لے آنا۔"

"ٹھیک ہے بھائی صاحب! ہم کل آجائیں گے۔"

فون رکھنے کے بعد حیفہ موم نے بیانکا کو کنٹکی کٹ جانے کے بارے میں بتایا تھا۔

دونوں نہیں جانتی تھیں کہ کل وہاں جاکر وہ اپنی زندگی کی کتنی بھیانک غلطی کرنے والی ہیں۔

☼ ☼ ☼

سیرین کے گھر کا دروازہ مقفل تھا۔ شہرام بڑی دیر اس مقفل دروازے کو گھورتا رہا، جبکہ طامیر کو ایک گونا تسلی ہوئی تھی۔

"یہ لوگ کہاں گئے ہیں؟" قریب کھیلتے بچوں میں سے اس نے ایک سے پوچھا تھا۔

"تھوڑی دیر پہلے نیچے کی طرف... شاید بڑے بازار..." لڑکے نے اپنی عمر کے مطابق جواب دیا تھا۔

"چلو اب... کیا رات تک یہاں ہی کھڑے رہنے کا ارادہ ہے۔" طامیر نے اسے ٹھوکا دیا تھا۔

"ہاں... چلتے ہیں۔" وہ افسردگی کے عالم میں آگے بڑھنے لگا۔

اوپر تک پہنچنے کے باقی سارے سفر کے دوران شہرام، طامیر کو پرنسٹن یونی ورسٹی کی باتیں بتاتا رہا تھا۔ باتیں اور قصے شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح بڑے پرپیچ اندر ہی اندر بل کھاتے ہوئے اور ایک دوجے کے ساتھ جڑکر بندھے تھے۔ باتیں بہت تھیں اور زبان صرف ایک... شہرام کی آواز میں چھپی ہوئی عجلت در آئی تھی۔ وہ لمحوں میں سالوں کی کہانیاں سنانا چاہتا تھا۔ خود طامیر کے پاس شہرام کو بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس تہی دامنی کے احساس نے اس کی زبان کو گنگ ہی کیے رکھا۔

وہ دونوں گھر جانے کے بجائے ریسٹورنٹ کی طرف چل پڑے تھے۔ شام ہونے والی تھی اور اماں زیتوبیہ اور بابا زلاری عموماً" اس وقت تک ریسٹورنٹ آجاتے تھے۔ دونوں کا اندازہ غلط نہیں تھا۔

بھاری بھرکم جسم والی اماں زیتوبیہ سفید قصابہ (عورتوں کا سر پر باندھنے کا رومال) اور سفید ایپرن باندھے شہرام کو دور سے ہی نظر آگئی تھیں۔ ایپرن کے معاملوں میں اماں زیتوبیہ بڑی نفیس اور ایک طرح سے بدقسمت واقع ہوئی تھیں۔ بازار میں ملنے والا کوئی بھی بڑے سے بڑے سائز کا ایپرن بھی ان کے سارے جسم کو ڈھانپنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ مجبوراً" اماں زیتوبیہ کو اپنے لیے خود ہی ایپرن سلوانے پڑتے تھے اور اس کام میں باوجود بے انتہا محنت کے بھی وہ دلکشی نظر نہ آتی تھی، جو فیکٹری سے نکلنے والے ایپرنز کا خاصا

ہوتی ہے۔

"ماما جان... " اندر داخل ہو کر شہرام نے اماں زیتونیہ کو دور سے ہی پکارا۔ تو انگیٹھی میں کوئلوں کو آہنی سلاخ سے ترتیب دیتے ہوئے انہوں نے آواز کی سمت میں دیکھا تھا اور جیسے لمحے میں ان کے دل کی دھڑکن بے انتہا تیز ہو گئی تھی۔

شہرام خود آگے بڑھ کر ان کے گلے سے لگ گیا تھا اور اماں زیتونیہ اسے بے تحاشا چومنے لگی تھیں۔

"اوہ میرے بیٹے... اللہ نے کیسا زبردست تحفہ دیا ہے مجھے آج..."

بانہوں میں بھینچ لینے کے باوجود بھی جیسے انہیں شہرام کے آنے کا یقین نہیں ہو رہا تھا۔

"رات ہی مجھے خواب آیا... سب لوگ کہہ رہے تھے کہ دیکھو عید کا چاند نظر آ گیا... اور میں خواب میں ہی سوچتی رہی کہ ابھی تو عید آنے میں چھ مہینے باقی ہیں... مجھے نہ جانے کیوں اندازہ ہی نہیں ہوا کہ وہ چاند تیری آمد کا اشارہ تھا۔"

"کوئی اور بھی آیا ہے ساتھ خالہ... چاند نہ کہیے... دم دار ستارہ ہی کہہ لیں۔"

طامیر نے دروازے سے ہی ہانک لگائی تھی۔ جواباً" تینوں ہنسنے لگے تھے۔ اماں زیتونیہ نے آگے بڑھ کر اسے بھی گلے سے لگا لیا تھا۔

"بابا کہاں ہیں؟"

"وہ اسٹور میں ہیں... اوزار تیز کر رہے ہیں۔"

"کس پر...؟" اسٹور کی طرف بڑھتے ہوئے شہرام نے کسی قدر شوخی سے پوچھا تھا۔ جواباً" اماں زیتونیہ بوکھلا گئی تھیں۔

"کر لو... کر لو... اپنے باپ کی طرح تم بھی تنگ کر لو مجھے... ہاں "سان" پر... اور یہ دیکھ۔" وہ انگیٹھی کی طرف بڑھی تھیں۔ پھر وہاں سے ایک چھوٹی سی چیز اٹھا کر انہوں نے شہرام کو دکھائی تھی۔ شہرام اس چیز کو پہچانتا تھا۔ وہ "سلی" تھی۔

"تیرے بابا زلاری نے دی مجھے... میری سالگرہ پر... مجھے تنگ کرنے کا وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔"

"کیسا شور ہے یہ باہر... البانیہ کا وزیر تو نہیں آ گیا؟" ٹوکے کی دھار کو دیکھتے ہوئے بابا زلاری اسٹور روم سے باہر نکلے تھے۔ پھر ان کی نظر چاروں طرف گھومی تھی۔

"بابا...!" شہرام کی آواز میں پیار کا لوچ تھا۔ بابا زلاری کا رویہ بھی تقریباً" تقریباً" اماں زیتونیہ جیسا ہی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کل رات ان کو کوئی خواب نہیں آیا تھا۔ شہرام کو چھٹیوں میں اپنے ملک آنے کے فیصلے پر طمانیت بخش احساس ہوا... جو خوشی اسے یہاں آ کر ہوئی تھی وہ دنیا کے کسی کونے میں جا کر حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

لیکن پھر اگلے ہی دن اس کی یہ خوش فہمی دور ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

بڑے ہال نما کمرے میں حیفہ مام اور بیانکا کے علاوہ وہ پانچ بھی تھے۔ تایا غفار' چچا جلال' تائی شہناز' چاچی فیروزہ اور تایا غفار کا بیٹا احمد...

تایا غفار اور چچا جلال قدرے بوڑھے ہو گئے تھے۔ ان کے مقابلے میں الیاس اپنے آخری وقت تک فٹ رہا تھا۔ شہناز اور چاچی فیروزہ بھی میک اپ کے سہارے جینے والی خواتین تھیں۔ جبکہ احمد شاہ اپنی پڑھائی کی وجہ سے ان سب سے میچ نہ کھاتا تھا۔ وہ کسی حد تک بیانکا کو پرکشش لگا تھا۔

بڑے ہال نما کمرے میں خاموشی کا راج تھا۔ وہ چھ لوگ صوفوں پر بیٹھے تھے اور احمد دروازے کے پاس کارنس پر ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ان چاروں کی نظریں قالین کے ڈیزائن میں الجھی ہوئی تھیں اور ہونٹ بند تھے۔

کھانے کا بہت پر تکلف اہتمام کیا گیا تھا اور بیانکا کو آج ان سب کا رویہ بھی معمول سے زیادہ خوش گوار محسوس ہوا تھا۔

"آپ نے کیا ضروری بات کرنی تھی... بھائی

صاحب!" حیفہ مام یہ بات کوئی پانچویں دفعہ پوچھ رہی تھیں۔ لیکن اب تک انہیں ٹھیک سے اس بات کا جواب نہیں دیا گیا تھا۔

اب شاید اس بات کے لیے ہی خاموش رہ کر باقاعدہ تمہید باندھی جارہی تھی اور بیانکا کو نہ جانے کیوں اس خاموشی سے وحشت محسوس ہو رہی تھی۔

"الیاس تم سے بہت پیار کرتا تھا حیفہ!" بالآخر چچا جلال نے اپنا جھریوں زدہ چہرہ ہلاتے ہوئے بات کا آغاز کیا تھا۔

"اور یقیناً" تم بھی کرتی ہو.... اسی لیے مجھے یقین ہے کہ الیاس کی کوئی بھی بات تمہارے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔"

"آپ بیان کریں میں سن رہی ہوں۔" حیفہ مام نرم لہجے میں بولی تھیں۔

"یقیناً" اس نے تم سے بات کی ہوگی، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو میں بتا دیتا ہوں۔" چچا جلال پھر خاموش ہو گئے تھے۔ چاروں کے چہروں پر مصنوعی جھجک جھلک رہی تھی۔

"دراصل الیاس بھائی اس بات کا اکثر ذکر کرتے تھے کہ بیانکا اور احمد کی شادی ہو جائے؟" بڑا ہال نما کمرہ بیانکا کی نظروں کے سامنے گھوم گیا تھا۔ اس خاموشی سے وحشت کی وجہ اسے اب سمجھ میں آئی تھی۔

اس نے حیفہ مام کی طرف دیکھا۔ ان کی صرف آنکھیں ہی پھیلی تھیں۔

"الیاس نے کبھی مجھ سے اس موضوع پر بات نہیں کی۔" وہ اسی نرم گوئی سے گویا ہوئی تھیں "اور اگر انہوں نے یہ بات آپ سے کی ہے تو مجھے حیرت ہے۔ انہوں نے بیانکا کے لیے احمد کی خواہش کا اظہار کیسے کر دیا۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا حیفہ! ہم سب اس بات کے گواہ ہیں۔"

"الیاس بڑی اچھی طرح یہ بات جانتے تھے کہ بیانکا آریز کو پسند کرتی ہے اور جلد ہی دونوں کی شادی کر دی جائے گی۔"

پورا ہال گویا دوبارہ سناٹے میں چلا گیا تھا۔ بیانکا، آریز کو پسند کرتی ہے کہ الفاظ کسی نشتر کی طرح سب کے چہروں پر پڑے تھے۔ شہناز اور فیروزہ نے منہ بسورا تھا۔

"بیانکا ہمارے بھائی کی آخری نشانی ہے۔ تمہیں اس رشتے پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے حیفہ!"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بھائی صاحب.... لیکن اس معاملے میں، میں سارے اختیارات اپنے پاس نہیں رکھتی۔"

"بیانکا کم عمر ہے.... نادان ہے.... اپنا اچھا برا نہیں سمجھ سکتی.... تم اسے سمجھا سکتی ہو۔"

"بیانکا اتنی بھی کم عمر اور نادان نہیں ہے۔ آریز اس کا کلاس فیلو ہے۔ میں اس رشتے سے مطمئن ہوں۔"

"اپنے ہمیشہ غیروں کی نسبت بہتر ثابت ہوتے ہیں حیفہ!"

"آپ کی اس بات سے میں اتفاق نہیں کرتی بھائی صاحب.... جب الیاس مجھے ملے تو وہ میرے لیے بالکل اجنبی اور غیر تھے۔ لیکن پھر وہ ہی میرے لیے مکمل ثابت ہوئے، جبکہ لبنان میں میرے اپنے رشتے دار اتنے برے نکلے کہ میں اپنی ماں کی وفات پر بھی وہاں نہ جاسکی۔"

"تمہاری تو کیا بات ہے حیفہ...."

جیسے بھرے بازار میں کوئی کسی کو فحش گالی دے دے، یہ فقرہ اس طرح ادا ہوا تھا۔ حیفہ مام کے چہرے پر کالے بادلوں کا سایہ آکر گزرا تھا۔

چچا جلال اب گردن جھکائے جیسے اپنے کسی اندرونی جذبے کو قابو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شہناز اور فیروزہ بھی جلال کے رویے کی ہی تقلید کر رہی تھیں۔

پھر تایا غفار صوفے پر آگے کو کھسکے تھے۔

"بیانکا ہمارے بھائی کی اولاد ہے۔ کیا ہمارا اس پر کوئی حق نہیں۔ ہمارے بھی کئی ارمان ہیں۔" اب کے جذباتی وار کیا گیا تھا جس میں یہ خاندان پیڑھی در پیڑھی مہارت حاصل کر چکا تھا۔

"آپ کے ارمانوں کی میں دل سے قدر کرتی ہوں۔

آپ چاہیں تو یہ شادی اس گھر سے بھی ہو سکتی ہے، لیکن احمد..."

"احمد میں آخر کمی کیا ہے؟"

"بات کمی بیشی کی نہیں... بات پسند کی ہے، بیانکا..."

"ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو اتنی آزادی دینے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ اپنے لیے خود رشتے تلاش کرتی پھریں۔" تایا غفار کی آواز بھی کسی دبے ہوئے غصے کے باعث قدرے تیز ہو گئی تھی۔

"افسوس یہ آپ کا خاندان نہیں ہے۔"

حیفہ مام نے اپنی نرم مزاجی سے یہ ثابت کر دیا کہ انہیں زندگی میں آج پہلی بار اس طرح کے رویوں کا سامنا کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔

"یہ الیاس کا خاندان ہے۔" وہ دوٹوک گویا ہوئیں۔

"تمہارا خاندان ہے۔" سر اٹھا کر چچا جلال پھر بولے تھے۔ ان کے لہجے سے نخوت کے بیج پھوٹتے تھے اور طنز ستار پر تنی تار کی طرح خوب کس کر نکلا تھا۔

حیفہ مام ان کی شکل دیکھتی رہ گئی تھیں۔

"ہاں... میرا خاندان..."

انہیں ان سب کے خوش نما چہروں کے پیچھے اپنے لیے نفرت دیکھ کر دکھ ہوا تھا اور یہ دکھ ان کی آواز سے جھلکنے لگا تھا۔

"اس ضمن میں تو پھر ساری بات چیت ہی لاحاصل ہے، اٹھو بیانکا۔" حیفہ مام اٹھی تھیں۔ بیانکا نے بھی اٹھنا چاہا تھا۔

"بیٹھو حیفہ! خدا کے لیے دو منٹ بیٹھو۔" تایا غفار نے منت کی تھی۔

"تم چپ ہو جاؤ خبیث... میں بات کر تو رہا ہوں۔" وہ اپنے سے چھوٹے جلال پر گرجے تھے۔

"حیفہ! تم اس سارے معاملے کو اس رخ سے نہیں دیکھ رہیں، جس رخ سے ہم دیکھ رہے ہیں... بات سنو... اگر تم بیانکا کی شادی غیروں میں کرو گی تو بیانکا کے ساتھ الیاس کی محنت سے کمائی ہوئی ساری دولت بھی غیروں کو چلی جائے گی... اور..."

بیانکا اور حیفہ مام... دونوں سناٹے میں آ گئی تھیں۔ ان لوگوں کی سوچ اس حد تک گر سکتی ہے۔ دونوں کو اس بات کا گمان تک نہ تھا۔

"دولت میری بیٹی کی خوشیاں نگل لے... اس سے بہتر ہے کہ وہ مفلس ہو جائے۔"

"ہمارا یہ مطلب نہیں۔"

آپ کا مطلب جاننے کی مجھے کوئی ضرورت بھی نہیں، کیونکہ آپ کا مقصد مجھ پر واضح ہو گیا ہے۔ یہ دولت صرف الیاس کی محنت سے اکٹھی نہیں ہوئی۔ اس میں میری محنت کی حصہ داری بھی شامل ہے... اور اگر آپ اس بات کو نہیں بھی مانتے تو مجھے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ دولت کل بھی بیانکا کی ہے اور آج بھی اسی کی ہے۔"

"لیکن ہمارے بھائی کے اثاثوں پر ہمارا بھی کچھ حق ہے حیفہ!"

"یہ حق قانونی طور پر آپ کا نہیں ہو سکتا، کیونکہ الیاس کی بیٹی اور بیوہ ابھی زندہ ہیں۔"

"کہیں تمہیں اپنے فیصلے پر پچھتانا نہ پڑے حیفہ... مخالفت میں کیے گئے فیصلے اکثر غلط ثابت ہوتے ہیں۔" وہ لڑکا نہ جانے کیسا نکلے۔

"کم از کم آپ الیاس کی اولاد کے بارے میں تو اچھا سوچ سکتے ہیں... اور الیاس نہ صرف اس لڑکے کو جانتے تھے... بلکہ پسند بھی کرتے تھے۔"

"یہ فیصلہ کرنے کے بعد تم ایک بار پھر اکیلی ہو جاؤ گی حیفہ۔"

"یہ امریکا ہے... غفار بھائی... یہاں ہر دوسرا شخص اکیلا ہے۔"

"زندگی کے بہت سے موڑ ہیں جہاں تمہیں ہماری ضرورت پڑے گی۔"

"اگر آپ کو الیاس کی اولاد سے واقعی محبت ہو گی تو آپ میرا ساتھ ضرور دیں گے... ورنہ صبر کرنے کے سوا میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں ہو گا۔"

"تمہیں بھی اس محبت کا ثبوت دینا چاہیے حیفہ..."

احمد الیاس کا بھتیجا......"

"اب میں آپ کو جواب نہیں دوں گی۔ آپ دائرے کی صورت میں بحث کررہے ہیں۔ گھوم پھر کر بار بار وہی بات، وہی سوال، وہی التجا......"

"سنو حیفہ!" یہ چاچی فیروزہ کی آواز تھی۔

"تمہیں ڈر کس بات کا ہے۔۔۔ اگر تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ بیانکا اپنی محبت میں حد سے گزر چکی ہے تو یقین کرو، ہمیں اور احمد کو تب بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یہاں کا ماحول......"

فیروزہ نے کہا اور لمحے بھر میں حیفہ مام نے خود کو ہواؤں میں معلق پایا.... بیانکا کو سانس لینے کا طریقہ یاد کرنے میں لگا کہ زمانے بیت گئے۔

"آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔" حیفہ مام چلائی تھیں۔ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا۔ "آپ کی ہمت کیسے ہوئی اتنی گھٹیا بات کرنے کی۔" چاچی فیروزہ چپ کرگئی تھیں۔

"اٹھیے مام.... اب گھر چلتے ہیں.... بس بہت ہوگئی۔"

"تم بیٹھو...." تایا غفار دھاڑے تھے اور کچھ اس طرح دھاڑے تھے کہ چچا جلال کو بھی پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ "تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں کہ جب بڑے بات کررہے ہوں تو چھوٹے نہیں بولا کرتے۔"

بیانکا نے حیرت سے تایا غفار کی طرف دیکھا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کا دماغ بھی درست کام نہیں کررہا تھا۔ روپے پانی کی طرح سر سے اوپر ہوگئے تھے۔

"اس کے والدین نے اسے خود اعتمادی سکھائی ہے۔ کیا اچھا ہے کیا برا۔ یہ جانتی ہے۔" حفیہ مام نے شال کھول کر کندھوں پر ڈالی تھی۔ بیانکا نے ان کا ہینڈ بیگ پکڑلیا تھا۔

"والدین نے تو اسے اور بھی بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ جیسی ماں ویسی بیٹی، تم نے الیاس کو پھانسا تھا۔ اب بیانکا نے نہ جانے کس کو پھانس رکھا ہوگا۔"

"آپ شروع سے ہی مجھے ناپسند کرتی ہیں۔ اس بات کا مجھے اندازہ تھا، لیکن آپ مجھ سے نفرت کرتی ہیں۔ یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔"

حیفہ مام کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی تھیں۔ چاروں اپنی جگہوں پر دم سادھے بیٹھے رہے تھے۔ کسی نے انہیں نہیں روکا تھا۔ اب روکنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ حفیہ مام یہاں دوبارہ کبھی نہ آنے کا عزم کرچکی تھیں۔

دروازے کے قریب پہنچ کر حیفہ مام نے ہینڈل گھمایا تھا۔ دروازہ لاک تھا۔

"احمد.... دروازہ کھولو۔" حیفہ مام نے قریب کھڑے احمد سے کہا تھا۔ کارنس سے پشت ہٹا کر احمد نے صوفے پر بیٹھے اپنے خاندان کی طرف دیکھا تھا۔ سوالیہ نظروں سے.... جواب نہ جانے کیا آیا تھا۔ احمد اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔

"دروازہ کھولیے...." پیچھے پلٹ کر حیفہ مام نے سب سے کہا تھا۔ سب یک دم کھڑے ہوئے تھے۔

اور تب ہی.... تب ہی.... شیر کے پنجوں کی کھرچ.... بیانکا نے اس کمرے کی فضا میں سنی تھی۔ یک لخت ان سب کی صورتیں اس قدر بگڑ گئی تھیں کہ بیانکا کو خود پر خوف کی پھونکیں پڑتی محسوس ہوئی تھیں۔ اس کا دل ڈوبنے لگا تھا اور دھڑکن پورے وجود پر چھا گئی تھی۔ گردوں کے دل ----- اس نے ان سب کی کالی سیاہ آنکھوں میں آ کر بیٹھتے دیکھے تھے۔

حیفہ مام کو پیچھے ہٹا کر وہ خود دروازے کا ہینڈل کسی قدر تیزی سے گھمانے لگی تھی۔ ایسے جیسے کسی کم پانی والے کنویں کی چرخی کھینچ رہی ہو۔ دروازہ اپنی جگہ سے سرکا تک نہیں تھا۔

مایوس ہوکر اس نے مضبوط دروازے کو دیکھا تھا۔

"دروازہ کھولیے۔" حیفہ مام چلائی تھیں۔

"یہ دروازہ اتنے آرام سے نہیں کھلے گا۔"

تایا غفار نے کہا تھا۔ ان کے چہرے پر بڑی زہر خند مسکراہٹ چمک رہی تھی۔

ان چاروں میں ایک پانچواں احمد بھی شامل ہوگیا تھا اور ان پانچوں کا گھیرا تنگ ہوتے ہوتے ان کے قریب آنے لگا تھا۔

حیفضہ مام کے کندھے کے پیچھے سے اس نے ان سب کو دیکھا تھا۔ جیسے بھیڑیے شکار کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہیں۔ ان کے گرد بھی گھیرا تنگ ہونے لگا تھا۔

حیفضہ مام بیانکا کے آگے کسی ڈھال کی طرح تن گئی تھیں۔

"کیا چاہتے ہیں آپ لوگ؟"

حیفضہ مام نے کانپتی آواز سے پوچھا تھا۔

وہ پانچوں کچھ نہیں بولے تھے، لیکن ان کے خطرناک ارادے ان کے چہروں سے عیاں تھے۔ تب ہی ہال نما کمرے کی دیواریں جیسے پھٹ گئی تھیں، اور ان کی دراڑوں سے کسم کا رنگ ٹپکنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کانسی رنگ کے بیل بوٹوں والے سنہری مصری مٹی کے سفید لشک والے چھوٹے فنجان (پیالے) تھے۔ جن میں گاڑھا لاہی سیال بھاپ اڑاتا تھا' ایسے کہ اس سیال پر جائفل کے کاٹھ کے ریشے بکھرے ہوئے اور سرخ رنگ تلچھٹ میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا۔

اماں زنتوبیہ نے گھر پر ایک چھوٹے سے جشن کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں سیرین اپنی والدہ کے ساتھ کافی دیر سے شامل ہوئی تھی۔

وہ xhubleta (ایک روایتی لباس) زیب تن کیے ہوئے تھی اور پیاری لگنے کی ساری حدوں کو پھلانگ کر آئی تھی۔ اس نے ماتھے پر سوکے (سرمے کی لکیر) کے تین خط اس احتیاط سے کھینچے تھے کہ تینوں لکیروں کے درمیانی فاصلے میں بالشت بھر کر فرق بھی نہیں آیا تھا اور ان کے اوپر "سر سری" (ماتھے کا زیور) اپنی جھالر پھیلا رہا تھا۔

خود شہرام opinga (مکمش سے بنے البانی چمڑے کے جوتے) qeleshe (ٹوپی) اور fustanella (روایتی لباس) میں بائرن (شاعر) کے پورٹریٹ کی عکاسی کر رہا تھا۔

نانی پتیتی اماں زنتوبیہ آج خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں۔ ان کی نظریں رقص کے بجائے باری باری شہرام اور سیرین کا طواف کر رہی تھیں۔

طامیر کی منگیتر راحافیہ دائرے کی صورت میں مشہور روایتی رقص کر رہی تھی اور اسی گول دائرے میں ٹھس ٹھنسا کر طامیر بھی راحانہ کی سہیلیوں کے ساتھ پرویا ہوا محو رقص تھا۔

بڑے گہرے سرخ قالین پر شہرام اور سیرین ساتھ ساتھ بیٹھے تھے' اور ان کے بالکل سامنے ولائی حسنی اپنی چوب دار آنکھوں سے سارے منظر کو بنا تاثرات کے گھور رہا تھا۔ شہرام کو حسنی کے رویے میں بڑی سرد مہری نظر آئی تھی۔ وہ پہلے سے ہی کم گو تھا، لیکن اتنا زیادہ نہیں.... ساڑھے تین سال پہلے تیرانا (شہر) میں مدر ٹریسا ایرپورٹ پر شہرام کو الوداع کہتے ہوئے انہوں نے کسی قدر شوخی سے شہرام کی کمر پر دھپ مارتے ہوئے کہا تھا۔

"یار واپس آکر بتانا ضرور کہ یہ انگریزنیاں واقعی میں خوب صورت ہوتی ہیں یا صرف کہانیاں ہی بنی ہوئی ہیں۔" حسنی ہنسا تھا اور شہرام کے کان کی لوئیں سرخ ہو گئی تھیں۔

اب پندرہ دن کے ٹور پر آتے وقت وہ اپنی یونی ورسٹی کے چھوٹے بڑے کتنے ہی قصے اکٹھے کر کے لایا تھا۔ ولائی حسنی کو سنانے کے لیے۔

لیکن ساڑھے تین سال کے اس عرصے نے دونوں میں وہ تکلف قائم کر دیا تھا' جسے ختم کرنے میں اگلے دس سال بھی ناکافی تھے۔

"ولائی...." شہرام حسنی کو دوبارہ بلا رہا تھا۔

"ہاں.... بولو...." وہ بنا چونکے بولا۔

"آپ کا قہوہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

"میں ٹھنڈا ہی پیتا ہوں.... تم اپنے قہوے کی فکر کرو۔" وہ سرد مہری سے بولا۔

"کمال ہے.... قہوہ تو گرم پینے میں ہی مزا آتا ہے۔ آپ نے ٹھنڈا کر کے پینے کا اصول کہاں سے اپنا لیا؟"

"تم.... اب تم مجھے بتاؤ گے اصول...."

"میں نے تو ویسے ہی کہا ہے ولائی۔"

"تم اپنے کام سے کام رکھا کرو شہرام.... اپنی پڑھائی

کا رعب مجھ پر ڈالنے کی کوشش مت کرنا۔" اس کی آواز کافی تیز ہو گئی تھی۔ اماں زیتو بیہ تالی بجانا بھول گئی تھیں۔ رقص کرتے کرتے طامیر بھی نہ جانے کیوں ساکت ہو گیا تھا۔ شہرام کے چہرے پر سیاہ رنگ آ کر ٹھہر گئے تھے۔

"گانے کی آواز تھوڑی تیز کرو شہرام۔" بابا زلاری درمیان میں بولے تو سب کی توجہ بٹی تھی۔

"دیکھو تمہارا دوست کیسا لطف لے رہا ہے.... اور تم کب سے یہاں ہی بیٹھے ہو۔" اماں زیتو بیہ نے جیسے اسے ترغیب دی تھی۔

"آؤ سیرین! ہم بھی ان میں شامل ہو جاتے ہیں۔" شہرام اٹھا تھا اور اس نے اپنا ہاتھ سیرین کی طرف بڑھایا تھا۔

سیرین اپنی جگہ سے نہیں اٹھی تھی۔

"واپس بیٹھ جاؤ شہرام! میرا رقص کرنے کا بالکل بھی ارادہ نہیں ہے۔" سیرین اپنی سیدھ میں دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ "میں ابھی نیچے سے آ رہی ہوں۔ اور کافی تھک چکی ہوں۔"

"راحافہ کا گھر تمہارے گھر سے بھی کافی دور ہے سیرین۔ لیکن اسے..."

"مجھے مزید بھوک نہیں ہے۔ میں اپنے کمرے میں آرام کرنے جا رہا ہوں۔"

شہرام کی بات مکمل ہونے سے پہلے اور سیرین کے جواب دینے سے پہلے حسنی کسی کل دار پرزے کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔

"بھوک نہیں ہے تو ویسے ہی بیٹھ جائیں ولائی۔"

"جشن کا اہتمام تمہارے لیے کیا گیا ہے شہرام۔" اس کے لہجے سے طنز کا عنصر پھوٹتا تھا۔ "میرے لیے نہیں۔ کھل کر انجوائے کرو۔"

رومال سے اپنے ہونٹوں کے کونے صاف کرتے ہوئے وہ بولا تھا۔ اور ارادتاً" اس کی نظر شہرام کے دائیں طرف جا کر ساکت ہو گئی تھی پھر وہ اسی طرح اپنے ہونٹ صاف کرتا کمرے میں چلا گیا تھا شہرام کے دائیں طرف سیرین بیٹھی ہوئی تھی۔ جس کے ماتھے پر سوکے کی تینوں لکیریں پسینے سے بھیگ گئی تھیں۔

شہرام واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا اور دائیں طرف سیرین کے کان کے قریب چہرہ لاتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

"ولائی حسنی کو تم سے شرم آتی ہے شاید۔ پتا نہیں ہمارے شادی کے بعد ان کا کیا حال ہوا کرے گا۔"

سیرین کا رنگ ایک دم پیلا پڑا تھا۔ شہرام جھینپ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ سیرین کافی سے زیادہ شرمیلی ہے۔ اور ایسے میں "ہماری شادی" کے الفاظ نے اس پر کیسے اثر کیا تھا۔ اس بات کا اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں تھا۔

طامیر اپنی منگیتر کے پاس تھک کر بیٹھ گیا تھا اور میوزک ہلکا کر دیا گیا تھا۔

"اب جلد ہی حسنی کی بھی شادی کر دینی چاہیے۔"

"وہ مانے بھی تب نا۔" اماں زیتو بیہ نے جواب دیا تھا۔

"سیرین! بھائی کے لیے تم کوئی لڑکی ڈھونڈو نا۔ بالکل اپنے جیسی۔ تمہاری پسند کو وہ انکار نہیں کریں گے۔' شہرام نے سیرین سے کہا تھا اور تب ہی بے اختیار شہرام کی نظر سیرین کی گردن پر پڑی تھی۔ وہاں سے نظر ہٹا کر بری طرح سے پھر اس نے سیرین کے ہاتھوں کو ٹٹولا تھا اور جیسے رات کے اکلوتے راجا چاند کا سنگھاسن بھی اختتام پذیر ہو گیا تھا۔

بابا زلاری بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے اور اماں زیتو بیہ سیرین کی والدہ کے ساتھ کچن میں گم ہو گئیں۔

"تم نے ہماری منگنی کی انگوٹھی نہیں پہنی سیرین۔"

اکیلے ہونے پر بہت دیر کی روکی ہوئی بات کو شہرام نے ادا کیا تھا۔ اس کے لہجے میں سرسری پن نہیں تھا بلکہ ایک طرح کی جواب طلبی تھی۔

"وہ ذرا ڈھیلی تھی۔ میں نے سوچا کہیں گر ہی نہ جائے۔"

"تمہیں اس پر دھاگہ باندھ لینا چاہیے تھا۔ آج کے دن کے لیے تم اتنا بھی تردد نہ کر سکیں۔"

"تم اس طرح اچانک آئے ہو شہرام کے کسی بھی چیز کے اہتمام کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔"

"اور وہ تعویز جو میں نے اپنی محبت کی نشانی کے طور پر تمہیں پہنایا تھا۔ وہ بھی تمہارے گلے میں نہیں ہے۔ کہیں تم اسے کھو تو نہیں چکیں۔"

"نہیں۔ وہ میرے پاس ہے، لیکن میں اسے ہر وقت نہیں پہن سکتی۔ میں لیٹتے وقت الجھن کا شکار ہو جاتی تھی۔ گلے پر باقاعدہ ایک زخم سا بن گیا تھا۔"

ان دونوں جوابوں نے شہرام کو افسردہ کر دیا تھا۔

وہ تعویز امریکہ جانے سے پہلے اس نے سیرین کو دیا تھا۔

صندل کی لکڑی کا وہ دو انچ کا ٹکڑا آدھ انچ موٹا تھا اور اس ٹکڑے کے ایک آدھے کونے میں سوراخ کر کے موٹی کالی ڈوری اس طرح ڈالی گئی تھی کہ سامنے اور پشت سے ڈوری نظر نہیں آتی تھی۔ اور یہ ڈوری ساکن لکڑی میں سے درخت کی شاخ کی طرح پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

بابا زلاری نے تعویز کو بڑے دنوں کی خاص توجہ اور دلی محبت کے بعد تکمیل تک پہنچایا تھا۔

ndoc Martini (البانی مصور) کا ایک گمنام اور بے نام پورٹریٹ جو بابا زلاری کو بے انتہا پسند تھا اور جسے وہ اتنی بار بنا چکے تھے کہ اس کی ایک ایک لکیر حاشیہ انہیں ازبر ہو چکا تھا۔ کو تعویز کے سامنے کی طرف کندہ کیا گیا تھا۔

ایک آٹھ نو سال کی بچی جو اپنے ننھے ہاتھ کے مکے کے اوپر تھوڑی ٹکائے اپنی آب دار آنکھوں میں کسی اجنبی جذبے کا انتظار لیے نجانے کس طرح دیکھتی نظر آتی ہے۔

"بابا! اس تعویز کے پیچھے ایک تحریر بھی ابھار دیں۔"

شہرام نے چھوٹی ریتی لیے تعویز پر جھکے بابا زلاری سے کہا تھا۔

"کیا۔؟"

"یہ۔ یہ کہ۔" اس نے تھوڑی دیر توقف کیا۔

"یہ کہ۔ تم سے جدائی ہوئی تو میں مر جاؤں گا۔"

کام کرتے بابا زلاری نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگے تھے۔

شہرام شرمندہ ہو گیا تھا۔

"آپ نہیں لکھیے۔ میں خود ہی لکھ لوں گا۔"

شہرام کی خفگی سے پر شکل دیکھ کر وہ سنجیدہ ہو گئے تھے۔

"تم ابھی بچے ہو شہرام۔ ورنہ یہ بات جان چکے ہوتے کہ کوئی کسی کے بغیر نہیں مرتا۔ سب جیتے ہیں۔ زندگی بڑی ٹھوس اور ڈھیٹ ہے۔ یہ ہر حالات میں گھسٹتی ہے۔ اور دوسری بات۔ ہم جن کے بغیر جی نہیں سکتے ان کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر وہ ہم سے محبت کرتے ہیں تو اس بات کو بخوبی جانتے ہیں۔" بابا زلاری نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔

تعویز مکمل ہوا تو وہ کتنی ہی دیر اس پر سے اپنی نظریں نہیں ہٹا سکا تھا۔ وہ تعویز لکڑی کا تھا لیکن سونے کی طرح چمکتا تھا۔ "لاکھ" نے اس میں دھوپ کی سی لشک پیدا کر دی تھی۔ پورٹریٹ اس قدر مہارت سے بنایا گیا تھا کہ صرف دھڑکنوں کی کمی رہ گئی تھی۔ اور آج سیرین کے دونوں جوابوں نے اسے افسردہ کر دیا تھا۔

اگر واقعی ایسا ہی تھا جیسا وہ کہہ رہی تھی تو پھر اس کے چہرے کے تاثرات نے اس کی بات کا ساتھ کیوں نہیں دیا تھا۔

گھر سے باہر سیرین کو الوداع کرتے وقت اسے اپنی بات کا جواب مل گیا تھا۔

"میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں شہرام! نجانے تم اسے کس تناظر میں پرکھو، لیکن ٹالنے کا اب کیا فائدہ۔ تم اچانک آ ہی گئے ہو تو میں بھی بتانے کے لیے پھر تمہید نہیں باندھوں گی۔"

سیرین اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوجے میں پھنسائے تذبذب کا شکار تھی۔ اس کا سارا حسن ایک دم ہی ماند پڑ گیا تھا۔

"میں آج بھی یہاں آنا نہیں چاہتی تھی، لیکن ایک بار تو آنا ہی تھا۔ ایک بار تو تم سے ملنا ہی تھا۔"

"کیا بات ہے سیرین۔ کہہ دو جو کہنا ہے۔"

شہرام نے کہا تو نظریں اٹھا کر سیرین نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

"تمہاری پسنائی انگوٹھی اس قدر ڈھیلی ہو چکی ہے کہ اب وقت کا کوئی بھی دھاگہ اسے ٹھیک نہیں کر سکتا۔"

"کیا مطلب سیرین۔ اس بات کا آخر کیا مطلب ہے؟" شہرام حیران ہوا تھا۔

"وہ ہی مطلب شہرام جو تم سمجھ چکے ہو۔ لیکن ماننا نہیں چاہ رہے۔"

"نہیں میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔ خدارا مجھے سمجھاؤ سیرین۔"

"سیرین بیٹا! جلدی آجاؤ۔" خالہ فیرن کی آواز آئی تھی۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھی سیرین کا انتظار کر رہی تھیں۔

"ہو سکے تو مجھے بھول جانا شہرام۔!" سیرین نے کہہ کر شہرام کے فق چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی اور جلدی سے ٹیکسی میں بیٹھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

خاموشی اور اندھیرے میں سماعت دو آتشہ ہو چکی تھی۔ فون در فون (سانپ کی پھنکاروں) کو بیانکا نے اپنے کانوں میں چنگھاڑتے سنا تھا۔ ضیاء ریز (روشنی دینے والا) کی کرم نوازیاں کہیں جا چھپی تھیں اور سبت سرگ (چھ اطراف) سیاہ چادریں اوڑھے ماتم کناں تھے۔

وہ پہلی سیڑھی پر ایسے بیٹھی تھی جیسے بگڑے نیل کے ماٹ کے پیندے میں بیٹھی ہو اور اس کے بارے میں غلط افواہیں بس پھیلنے ہی والی ہوں۔

تہہ خانے کے دروازے سے ہاتھ ہٹا کر اس نے سارے واقعے کو از سر نو یاد کیا تھا۔ ان کاغذات پر دستخط کردو۔ اور باقی کے سارے پروسیجر تک ہماری مہمان بن کے رہو۔ دروازہ نہیں کھلے گا۔"

حیفہ مام کے کندھے کے پیچھے سے وہ ان پانچوں کو دیکھ رہی تھی۔ جب تایا غفار نے ان کے آگے تین چار کاغذوں کو لہرایا تھا۔

بنا پڑھے ہی وہ جان گئی تھیں کہ وہ کس طرح کے کاغذات تھے وہ جائیداد کی منتقلی کے کاغذات تھے۔

بیانکا کا دل چاہا ان پانچوں کے منہ پر تھوک دے۔ یہ لوگ کس قدر ہیچ ہو چکے تھے۔

"خود کو مت تھکاؤ۔ یہ دروازہ نہیں کھلے گا۔ نہ ہی ٹوٹے گا۔"

"آپ نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا کہ میری بیٹی ان کاغذات پر دستخط کردے گی۔"

"یہ ہمارے بھائی کی جائیداد ہے۔ جو اس نے بہت محنت سے بنائی ہے۔ اس جائیداد پر تم دونوں ماں بیٹی کو ہم ہرگز قابض نہیں ہونے دیں گے۔"

"یہ میری بھی جائیداد ہے۔"

حیفہ مام چلائی تھیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ ان سب کے چہرے نوچ لیں۔

"تمہارے نام والے اپارٹمنٹ کی تو ہم بات ہی نہیں کر رہے۔ نہ ہی تمہارے اکاؤنٹ میں پڑے ہوئے دس ہزار ڈالر کی۔"

حیفہ مام ان کی درست معلومات پر دنگ رہ گئی تھیں۔ اتنے درست اعداد و شمار۔ وہ لوگ یقیناً" کافی عرصے سے اس چیز کے منصوبے بنا رہے تھے۔

"جو کچھ بیانکا کے نام منتقل ہوا ہے۔ ہم صرف وہ چاہتے ہیں۔"

"آپ سب کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" بیانکا بھی چلائی تھی۔

"چلو' ایسا ہی سمجھ لو۔ اب جلدی سے ان سب کاغذات پر دستخط کردو۔ آج کرو گی تو مزید پندرہ دن تمہیں اور یہاں رکنا پڑے گا۔ جتنے دن انتظار کرواؤ گی۔ تمہارا ہی نقصان ہوگا۔"

"میں ان پر سائن نہیں کروں گی۔"

"یہ تمہاری بھول ہے۔ تم ہمیں نہیں جانتیں۔" چچا جلال نے اسے قہر بار نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ مزید حیفہ موم کے وجود میں سمٹ گئی تھی۔

"الیاس کو اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ اس کے بھائی

کیسے سانپ ہیں اور ان کی بیویاں۔"

"پھر تم اس بات کو جلد ہی قبول کرلو۔ اور ہم کچھ برا نہیں کررہے۔ اپنے بھائی کی جائیداد ہی تو مانگ رہے ہیں۔"

"اس بھائی کی بیٹی ابھی زندہ ہے۔"

حیفہ مام نے چلا کر پھر وہی بات کی تھی جو وہ پہلے بھی کہہ چکی تھیں۔ اور جس کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"وہ بیٹی خود سرہو چکی ہے۔ اپنی ماں کی طرح۔ تب ہی تو ہمیں یہ طریقہ کار اپنانا پڑ رہا ہے۔"

"آپ سب کس خام خیالی میں ہیں۔ آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ چاہے ہم دونوں کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔"

"اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔" تایا غفار کی بات میں گھمنڈ تھا۔ بیانکا کو ان کے گھمنڈ پر ہنسی آئی تھی۔

"آخری بار پیار سے کہہ رہا ہوں۔ ان کاغذات پر دستخط کردو۔ ورنہ۔"

"ورنہ۔ کیا۔ کیا کریں گے آپ۔" حیفہ موم نے چلا کر پوچھا تھا۔

پانچوں خاموش ہوگئے تھے۔ یہ خاموشی پاتال کے اس زلزلے کی طرف اشارہ کرتی تھی جس کا بہاؤ رفتہ رفتہ زمینی سطح تک آرہا ہو۔

حیفہ مام کی آنکھوں میں اپنے ارادے کی پختگی تھی اور ان سب کے چہروں پر کچھ کر گزرنے کی جرات چمکتی تھی۔

پھر دھماکے دار گرج کے ساتھ آتش فشاں پھٹ پڑا اور ہر چیز پر پھوڑائی (چولہے کی جلی ہوئی مٹی والا) رنگ چھا گیا۔

پانچوں نے ان دونوں کو پکڑ کر گھسیٹا تھا نجانے کس سمت۔ وہ اپنا آپ بچانے لگیں، لیکن پانچوں کے مضبوط ارادوں اور زور آزما ہاتھوں کی گرفت کسی آہنی شکنجوں کی طرح تھی۔

بے اختیار ہو کر بیانکا نے چلانا شروع کردیا، اور تایا غفار نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے سفید گالوں پر جڑ دیا تھا۔

"چُپ کر . . . . !" اسے اس لفظ کا مطلب نہیں پتا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ اسے کوئی غلیظ گالی دی گئی ہے۔

شہناز اور فیروزہ نے دونوں کے پرس چھین لیے تھے اور اس چھینا جھپٹی میں حیفہ مام کی شال بھی اتر گئی تھی۔

چچا جلال نے اسے بالوں سے پکڑ کر تہہ خانے کے اندر دھکیلا تھا۔ ان کا چلانا، کراہنا۔ التجا کرنا۔ انہیں شرم دلانا اور خدا کے واسطے دینا سب بے کار ثابت ہوا تھا۔

"اب یہاں بیٹھ کر تسلی سے سوچو کہ تمہیں دستخط کرنے ہیں کہ نہیں۔" تہہ خانے کا دروازہ بند کرتے ہوئے جلال نے کہا تھا۔

تیز روشنی سے اندر آنے کے باعث پہلے پہل تو اسے کچھ نظر ہی نہیں آیا تھا۔ پھر جب رفتہ رفتہ بصیرت نے کام کرنا شروع کیا تو وہاں تاریک در و دیوار کے علاوہ اسے کچھ بھی نظر نہیں آیا تھا۔

اس اندھیرے میں ایک چیز چمکتی تھی۔ اور وہ حیفہ مام کی آنکھوں میں آئے آنسو تھے۔

☆ ☆ ☆

چوبی دروازے کو پیٹتے پیٹتے اس کے اپنے ہاتھ ساگوان کی لکڑی کی طرح سن اور ٹھوس ہوچکے تھے۔ اور ان میں خون کی گردش اپنی سرسراہٹ تک محسوس نہ کرواتی تھی۔

وہ تھک چکی تھی، لیکن پھر بھی دروازہ پیٹتی رہی اور اول فول بکتی رہی۔

اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ انہیں۔ انہیں امریکہ جیسے ملک میں۔ کسی تہہ خانے میں بند کردیا گیا ہے۔ تمسخرانہ ہنسی ان لوگوں کے انجام کو تصور میں لاتے ہی اس کے اندر کہیں دبی ہوئی تھی۔

"یہ لوگ نہیں جانتے کہ انہوں نے کتنی بڑی بے وقوفی کی ہے۔ اس قبیح حرکت کا سنگین خمیازہ انہیں

جلد ہی بھگتنا پڑے گا۔ یہ امریکہ کو پاکستان سمجھ بیٹھے ہیں۔" اس کا دل کیا کہ وہ ان لوگوں کی کم عقلی پر ماتم کرے۔

"یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس طرح یہ اپنی بات منوالیں گے۔"

غصے سے اس کی نسیں تن گئی اور وہ مزید زور سے دروازہ پیٹنے لگی۔

"ہمارے باہر جانے پر پولیس ان کا کیا حشر کرے گی۔ یہ لوگ اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔" بیانکا کو ان سب کی آنے والی حالت پر ترس آنے لگا۔

"الیاس۔! الیاس ان لوگوں سے کتنا پیار کرتا تھا۔ اور یہ سب کیسے ابلیس صفت۔ کیسے کریہہ نکلے۔"

حیفہ مام نے رندھی ہوئی آواز میں خود سے کہا تھا۔

وہ چوکور تہہ خانے کے کونے میں ایک لحاف کے اوپر بیٹھی تھیں۔ اور ان کے آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔ بیانکا کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ انہیں چپ کروائے، دلاسا دے۔ وہ گھنٹوں دروازہ پیٹنے سے فارغ ہونے والی نہیں تھی۔

پھر دروازہ ایک بار پھر کھل گیا۔

اندھیرے تہہ خانے میں روشن چچا جلال کا چہرہ نظر آیا۔ ان کے پیچھے دوسرے بھی سب کھڑے تھے۔ چچا جلال نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا تھا۔

"جلد ہی عقل آگئی۔" انہوں نے کہا۔

بیانکا کو وہ چہرے تیزاب سے جھلسے ہوئے نظر آئے تھے۔

تایا غفار نے دوبارہ اس کے آگے کاغذات کیے تھے۔ بیانکا نے وہ کاغذات پکڑے تھے۔ غفار نے اسے پین پکڑانا چاہا تھا لیکن تب تک بیانکا کاغذوں کو دو ٹکڑوں میں پھاڑ چکی تھی۔ اور وہ چار ٹکڑوں میں بٹے کل سولہ پرزے اس نے تایا غفار کے منہ پر دے مارے تھے۔

"تھو۔!" تایا غفار نے پہلے زینے پر دروازے کی دہلیز کے پار تھوکا تھا۔ اور دروازہ دھڑام سے دوبارہ بند کردیا گیا تھا۔

وہ بڑی دیر تک وہیں بیٹھی اس تھوک کو گھورتی رہی تھی۔

حیفہ مام کے رونے کی آواز تیز ہوگئی تھی۔

بیانکا نے اب دوسرے رخ پر سوچنا شروع کیا تھا۔ یہ بات ہضم کرنے اور ماننے میں تو اسے بہت دیر ہوگئی کہ وہ حیفہ مام کے ساتھ کسی تہہ خانے میں قید کردی گئی ہے، وہ اس حرکت کو ان لوگوں کا بچپنا تصور کررہی تھی اور جب اسے اپنے اور حیفہ موم کے تہہ خانے میں بند ہوجانے کا یقین ہوگیا تو اس نے نئی نئی خام خیالیاں پالنی شروع کردی۔

جیسے ابھی کوئی ہاتھ معجزاتی طور پر انہیں یہاں سے نکال لے گا۔ پولیس کو اپنے آپ ہی خبر ہوجائے گی۔ اور وہ برق رفتاری سے دونوں کی مدد کرنے یہاں پہنچ جائے گی۔ اردگرد کے دور نزدیک کے مکان والوں کو غفار، جلال، شہناز، فیروزہ، احمد کے ظلم کا علم ہوجائے گا اور سب مل کر بیانکا اور حیفہ مام کی خاطر تہہ خانے کی دیواریں تک توڑ ڈالیں گے۔

اس نے سیڑھی سے اتر کر پہلی بار تہہ خانے کا جائزہ لینا شروع کیا تھا۔ وہ ایسے رعب سے تہہ خانے میں چل رہی تھی جیسے جلد ہی کسی بادشاہی کرسی پر بیٹھ کر اوپر والوں کے لیے دار پر لٹکانے کا حکم صادر کرنے والی ہو۔

اس تہہ خانے میں ان سے پہلے یقیناً" لکڑیاں یا کوئلہ رکھا جاتا تھا۔ چھت دیواریں اور فرش بری طرح کالے ہوئے پڑے تھے۔ اور وہاں جیسے برسوں سے صفائی نہیں کی گئی تھی۔ سمبل لکڑی کے چھوٹے بڑے ریشے سارے فرش پر جابجا بکھرے ہوئے تھے کونے میں ایک غسل خانہ نو تعمیر شدہ تھا۔ کیونکہ اس کی دیواروں کا پلستر ابھی تازہ تھا اور دوسری دیواروں سے مختلف بھی۔

"تو ان حبشیوں نے انہیں قید کرنے کا منصوبہ یہاں بلانے سے پہلے ہی بنا رکھا تھا۔" اس نے سوچا اور ان کے انجام پر ہنسی۔

"یہ لوگ وہ گناہ کررہے ہیں جس کا کفارہ ان کی

آنے والی کئی نسلیں ادا کرتی رہیں گی۔" وہ دوبارہ ہنسی۔
غسل خانے کی دیوار میں چھت کے بالکل قریب ایک گول روزن تھا۔ بیا ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگی۔
روزن کو دیکھ کر سوچتے ہوئے وہ جس غلط فہمی میں تھی، وہ غلط فہمی اگلے دن دور ہوئی تھی۔ پوری طرح سے۔

☼ ☼ ☼

صنوبر اور دیودار کے دیو قامت درختوں کی ڈالیوں اور پتوں سے چھن کر آتی دھوپ دھرتی کے پر پیچ سینے پر بڑے بے ڈھنگے نقش و نگار بنا رہی تھی، لمحوں میں پہاڑی گستاخ ہوا کی ہلکی سی لرزش ان نقوش کو بگاڑ کر دوبارہ ایک نئی طرز پر مرتب کرنے پر ٹھن جاتی تھی۔
ڈیزائن کے جوڑوں پر آریوہی (راگ میں رائج ایک طریقہ) کی گانٹھیں کسی تھیں۔ اور جھرنے کی پھوار اس ملہاری دھن کو اپنے ہمراہ لیے قریب سے گزرتے سست اور خاموش اوس سے بھی زیادہ نزاکت سے بہتی اور ابھرتی جا رہی تھی۔
"بولو سیرین! کیا میں بدل گیا ہوں۔"
شہرام نے کدام کے واحد پیڑ کی چھاؤں تلے پڑے پتھر پر سر جھکائے بیٹھی سیرین سے پوچھا تھا۔
ارجیر کی جامد سرد ہوائیں جنہوں نے اسے کسی بچے کی طرح اپنی گود میں اٹھا کر بھرپور بوسہ دیا تھا انہیں ہواؤں نے اسے منہ کے بل گرانے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔
جشن کی رات سے اگلے ہی دن وہ سیرین کے گھر گیا تھا... پھر اس سے اگلے دن اور اس سے اگلے دن بھی... وہ جاتا رہا تھا روز بلاناغہ... مسلسل دس دن... اس سے تو جشن والی وہ رات گزارنا ہی مشکل ہو گیا تھا... اور ان دس دنوں نے تو اسے بالکل ہی پاگل کر دیا تھا۔
"وہ گھر پر نہیں ہے... شکودرا (ایک شہر) جا چکی ہے... اپنے ماموں کے پاس... صبح ہی وہاں سے فون آیا... ان کی طبیعت خراب ہے۔" سیرین کی والدہ فیرن نے اسے بتایا تھا۔
"مجھے وہاں کا نمبر چاہیے۔"
"فون ان کے گھر سے ایک کلو میٹر کے فاصلے پر ہے... تم فکر نہ کرو... وہ ایک دو دن تک آجائے گی۔"
وہ انہیں کیسے بتاتا کہ اسے کس چیز کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ وہ ہر روز سیرین کے گھر جاتا رہا تھا۔
"نہیں، وہ آج بھی نہیں آئی..."
"آج بھی نہیں... آج بھی نہیں۔"
وہ کہیں گئی ہوتی تو واپس آتی...
شہرام کو دیکھ کر خالہ فیرن کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی تھی۔ اور خود بخود ہی ان کی آنکھیں جھپکنے پر آجاتی تھیں۔
شہرام سوالات کرنے لگتا تھا اسے روز روز کے ان بہانوں پر یقین نہیں آتا تھا اس کا دماغ پھٹنے پر آگیا تھا۔
"کیا وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی؟"
"ایسی بات نہیں ہے... جو میں نے بتایا وہ ہی اصل بات ہے... تمہیں یقین کیوں نہیں آتا..." وہ منہ پرے پھیر لیتیں۔ جیسے اپنے آنسو اس کے سامنے بہانے سے ڈرتی ہوں۔
شہرام جواب میں کچھ نہیں کہتا تھا، لیکن آج وہ خالہ فیرن کو پرے ہٹا کر اندر جانا چاہتا تھا۔
"آپ جھوٹ بول رہی ہیں... وہ اندر ہے... طامیر نے خود اسے اندر آتے دیکھا ہے۔" اب خالہ فیرن باقاعدہ رونے لگی تھیں۔
"ہاں، وہ اندر ہے... پر تم سے ملنا نہیں چاہتی۔"
"میں اس سے خود مل لوں گا۔"
"ٹھہرو... میں اسے بلا کر لاتی ہوں۔"
خالہ فیرن اندر چلی گئی تھیں۔ جب وہ باہر آئیں تو ان کے ساتھ سیرین بھی تھی۔ حد درجہ مطمئن جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔
"تم میرے ساتھ آخر کیا کر رہی ہو سیرین؟" اسے دیکھتے ہی شہرام پھٹ پڑا تھا۔ اور وہ ایسے خاموش رہی تھی جیسے کسی کی لاش پر صبر کر کے بیٹھی ہو۔
کدام پیڑ کی ایک موٹی شاخ، چھاؤں کی تاریکی میں

ہونے کے باوجود بھی شہرام کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی۔
نظر اندازی، ناسپاسی، کراہت یا شاید بے وفائی، وہ سیرین کے رویے کو کس چیز کا نام دیتا۔
اس نے گلاب اور لالے کے ایک ساتھ گندھے پھولوں کو دیکھا۔
محبت اور رقیب...
پانچ سال پہلے اس نے اس منظر کو برا شگون جانا تھا اور پھر تب ہی اس نے اپنے خیالات جھٹک بھی دیے تھے۔ آج اسے پھر اس شاخ کے سائے سے خوف محسوس ہوتا تھا۔ سیرین اسی پیڑ کے نیچے ایک بیضوی پتھر پر بیٹھی اپنے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے پیروں کے نیچے چیڑ کی نرکونوں اور خشک سوئیاں پتوں کا ڈھیر لگا تھا۔
چمکیلی دھوپ کے ذرے شہرام کے سر پر برس رہے تھے۔ شاید یہ ہی وجہ تھی یا سیرین کا رویہ... شہرام کا سر لحہ بہ لحہ پھٹتا ہی جا رہا تھا۔
"بولو سیرین! کیا میں بدل گیا ہوں... کیا میں اب پہلے جیسا نہیں رہا۔"
"نہیں شہرام... قدرت اور زندگی نے ابھی تمہیں نہیں آزمایا... خوش قسمتی سے تم ویسے ہی ہو۔"
"تو پھر کیا تم بدل گئی ہو سیرین؟" سیرین کی آنکھیں چمک کر بجھی تھیں۔
"بدقسمتی میرے ساتھ تھی... میں آزمائی گئی اور آزمائش پر پوری نہ اتر سکی۔"
"میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا سیرین... ایسا رویہ نہ اپناؤ کہ مجھے کہنا پڑے کہ یہ محبت مجھے لے ڈوبی۔"
"میں کیا کروں شہرام! میرے بس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے بہکنا تھا۔ میں بہک گئی۔"
"تم ارجیر میں تھیں اور مجھ سے ملنا نہیں چاہتی تھیں... تم نے شکور دا جانے کا جھوٹا جواز کیوں گھڑا...؟"
"میں چاہتی تھی کہ تم مجھ سے دوبارہ ملے بغیر ہی امریکہ واپس چلے جاؤ... تم واپس چلے جاتے تو یہ سوال وجواب نہ کرتے... بس اس لیے۔"
"تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تم سے بات کیے بنا امریکہ چلا جاؤں گا۔" شہرام نے پوچھا تھا اور سیرین دھوپ میں کھلتی نرکونوں کو دیکھنے لگی تھی۔
"یہ سب کیا ہو رہا ہے سیرین... تم ایسا بھیانک مذاق کیسے کر سکتی ہو میرے ساتھ... ہماری محبت تو بچپن کی ہے۔"
"بچپن کی محبت کتاب کے پہلے ایڈیشن کی طرح ہوتی ہے شہرام... اس میں الفاظ کی بہت ساری غلطیاں نکلنے کا دھڑکا لگا رہتا ہے... یہ کتاب پرانی تو ہو سکتی ہے مگر مستند نہیں۔"
"کیا تمہیں وقت چاہیے...؟"
"وقت؟ کس لیے؟"
"سوچنے کے لیے... ہمارے بارے... ہمارے تعلق کے بارے... ہماری پرانی محبت کے بارے۔"
"تم وقت دینے پر بضد ہو تو میں لے لیتی ہوں... اگرچہ اب حاجت کسی بھی چیز کی نہیں میری التجا وہی رہے گی۔"
"کیا...؟"
"تمہیں بتا تو دیا ہے... پھر کیوں بار بار پوچھ کر مجھے اور خود کو تکلیف دے رہے ہو۔"
"تم التجا بتاتی ہو... لیکن وجہ نہیں۔"
"بے وجہ ہی سمجھ لو... لیکن کیا تم مجھے بھول نہیں سکتے شہرام... آسانی سے ہمیشہ کے لیے اس تعلق کو ہماری محبت کو، منگنی کو جیسے سرے سے کچھ ہوا ہی نہ ہو... کیا ہم دوبارہ صرف دوست نہیں بن سکتے۔ اچھے دوست بچپن کے۔"
سیرین کہتی چلی گئی اور شہرام کی آنکھوں کے کونوں نے گویا آگ پکڑ لی۔
"ان تین سالوں میں ایسا کیا ہو گیا سیرین؟"
"ہونے کے لیے تو ایک لحہ ہی کافی ہوتا ہے شہرام۔"
"پہاڑوں کی برف بھی ایک دن میں نہیں پگھلتی... یہ بدلاؤ اتنا بڑا ہے کہ لمحوں کی دین نہیں ہو سکتا۔"

"بہت سارے لمحے مل کر اکٹھے ہو گئے تھے....."

"دو ہفتے پہلے جب میں یہاں آنے والا تھا تو سوچتا تھا کہ ارجیر میں کیا کچھ بدل گیا ہو گا.... مجھے کچھ بھی بڑا بدلاؤ نظر نہ آیا.... ساری تبدیلیاں اپنی پرانی بنیادوں پر ہی ہوئی تھیں۔"

"میں سوچنے لگا ارجیر تو ویسا کا ویسا ہی ہے۔ میں کتنا غلط تھا۔ اب دیکھتا ہوں تو اپنے مشاہدے کی کجی نظر آتی ہے۔ کتنا تو بدل گیا ہے ارجیر.... انسانوں کے دل بدل گئے ہیں۔"

بڑی دیر تک وہ سستی سے بہتے ہوئے پانی کو جس میں سورج کی کرنیں اپنا مقام تلاش کرتی تھیں، دیکھتا رہا تھا۔ اور روتا رہا تھا۔

اس بات سے بے خبر کہ اس کی پشت پر بیضوی پتھر پر بیٹھی سیرین اٹھ کر واپس جا چکی ہے۔

☼ ☼ ☼

کابوسی سانسوں کے ساتھ بدن کو بار بار ہوا کے دوش پر اچھالنے کے عمل سے اس کے جسم کا جوڑ جوڑ درد کرنے لگا تھا۔ وہ سب اتنا خوفناک تھا کہ اس کے جھوٹ ہو جانے کا اسے منظم یقین تھا۔ سویدا (آسمان کا قلبی سیاہ نقطہ) سرنگوں کا ایک مہا جال بچھا تھا۔ یہ سرنگیں دائروں میں کھودی گئی تھیں۔ ان کی شروعات اور اختتام ایک ساتھ چل رہے تھے۔ اور وہ اس مہا جال میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔

اس گول روزن پر چاند کی روشنی اپنا وقت پورا کر چکی تھی۔

پردہ آفتاب زرد کتان کی طرح چھچھرا تھا۔

سورج کی بنفشی شعاعیں شیشے سے ٹکرا کر واپس پرے لوٹ جاتی تھیں۔ ان شعاعوں کی بہت پتلی دھار تہہ خانے کے اندر اتر رہی تھی۔ یہ روشنی براہ راست نہیں تھی۔ ترچھی اور پھر ترچھی۔ اس روشنی میں کم مائیگی کا احساس غالب تھا۔

حیفہ مام کی آنکھیں تہہ خانے کے نمیالے فرش پر اس تھوڑ دل روشنی کے گول دائرے پر جمی ہوئی تھیں۔

اڑتی چیل کا سا ایک سایہ تھا جو وقفے وقفے سے اس گول دائرے سے ٹکراتا تھا۔ اور پھر واپس پرے ہو جاتا تھا۔ چیل کے ٹکرانے سے شیشے پر ٹھک کی آواز پیدا ہوئی تھی اور یہ آواز اس تہہ خانے میں فنا ہوئی کسی چڑیل کی کریہہ کی طرح گونجتی تھی۔

کل رات کا بیشتر حصہ وہ اس روزن کی طرف منہ کیے مدد کے لیے پکارتی رہی تھی اس بات سے انجان کہ صدا الصحرا کی آواز جتنی مرضی گونج دار ہو' وہ لاحاصل ہوتی ہے۔ جب چلا چلا کر اس کا گلا بیٹھ گیا تو اسے اندازہ ہوا کہ روزن موٹے بلوری تختے سے ڈھکا ہوا ہے۔

پھر بھی وہ اتنی جلدی ہار ماننے والی نہیں تھی۔

اس نے تہہ خانے میں چاروں طرف نظر دوڑائی تھی۔ کل شام سے وہ یہ کام کافی بار کر چکی تھی۔ اور ہر بار اسے مایوسی ہی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں کھڑے ہو کر اس پر کمرے کا خالی پن واضح ہو گیا تھا۔ تہہ خانہ کسی بانجھ عورت کی طرح بنجر تھا۔ بستروں، لکڑی کے جا بجا بکھرے بھوسے اور ان دونوں کے علاوہ اور کوئی چیز اس کی کوکھ میں موجود نہیں تھی۔ اور شیشے پر مارنے کے لیے کوئی ٹھوس چیز درکار تھی۔

وہ بے چینی سے تہہ خانے میں ٹہلنے لگی۔ ایسے میں اسے حیفہ مام کا اطمینان کھٹکنے لگا تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ جس پر صبر کر لیا جائے۔ یہ ڈیڈ الیاس کی موت کی طرح کا حادثہ نہیں تھا جس پر رونے، آنسو بہانے کے علاوہ انسان بے بس ہوتا ہے۔ وہ ایک دم سے اتنی صابر اور شاکر کیسے ہوئی تھیں۔ انہیں ہرگز رونا نہیں چاہیے تھا۔ بلکہ کوشش کرنی چاہیے تھی۔ آخر وہ اتنی جلدی پست کیسے ہو گئیں۔ بیانکا کے لیے حیفہ مام کا یہ رویہ بالکل نیا تھا۔ اس نے آج تک حیفہ مام کو اتنا جھکا ہوا محسوس نہ کیا تھا۔

کونے میں دو دیواروں کا سہارا لیے حیفہ مام آدھی باتیں بیانکا سے اور آدھی خود سے کر رہی تھیں۔ اور ان کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

"شکر ہے' الیاس کی زندگی میں اس کا اپنے بھائیوں پر سے مان نہیں ٹوٹا۔ ورنہ۔ ورنہ اس نے تو دکھ سے ہی۔" حیفہ مام کہتے ہوئے پھر دکھی ہوئیں اور لحاف میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔

تہہ خانے میں چلتے چلتے بیانکا کے پاؤں دکھنے لگے تھے۔ اس نے اسٹریپ کھول کر اپنے دونوں پاؤں جوتوں سے آزاد کیے تھے۔ اور انہیں لکڑی کے بھوسے پر رکھ دیا تھا۔ وہ نازک مزاج بے شک نہیں تھی پھر بھی بہت ساری چھلتروں کو اس نے ایک ساتھ اپنے پیروں میں گھستے محسوس کیا تھا۔ کچھ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا ہلکا ہلکا یقین تھا اور کچھ ان ریشوں کی چبھن۔ وہ سراپا آنسو ضبط کرنے کی علامت بن گئی تھی۔

"بیٹھ جاؤ بیانکا۔ تمہاری بے چینی مجھے اور پریشان کر رہی ہے۔ میں صبح ان لوگوں کی پھر سے منت کروں گی۔"

اس نے حیفہ مام کی بات نہیں سنی تھی۔ اس کی نظر اپنی اونچی ہیل والے جوتوں پر تھی۔ روزن کافی اونچا تھا۔ لیکن اس نے کھیلنے سے پہلے ہارنے کا نہیں سوچا تھا۔

اس نے اپنے خیال کو فوری عملی جامہ پہنایا تھا۔ اور اونچی ہیل والے سینڈل کو روزن کے شیشے پر دے کر مارا تھا۔ پانچویں چھٹی دفعہ کے بعد اس کا نشانہ بالکل ٹھیک سہی جگہ پر لگنے لگا تھا۔

اس نے اپنی ساری طاقتوں کو یکجا کر لیا۔ اسے تھکنا نہیں تھا۔ بوجھل نہیں ہونا تھا۔ جاگتے اعصاب کو مرنے نہیں دینا تھا۔ اس کی ہمت لاجواب رہی تھی۔ ساری رات۔

ساتھ ساتھ وہ دوسرے عوامل پر بھی سوچنے لگی تھی۔

کیٹی نے اسے کل فون کیا ہو گا یا آج کرے گی۔ جیسے وہ ہر وقت ہر بات بتانے کے لیے کرتی رہتی ہے۔ اسے فون بند ملے گا۔ حیفہ مام کا بھی۔ وہ پریشان ہو جائے گی۔ گھر آئے گی۔ گھر لاک ملے گا۔ وہ پولیس کو انفارم کرے گی اور پولیس فوراً" یہاں پہنچ جائے گی۔

فرش پر کسی مردہ چیل کی طرح ٹکرا کر گرے ہوئے سینڈل کو واپس اٹھاتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

لیکن کیٹی کو اس گھر کا پتا کیسے چلے گا۔ اس گھر کا ایڈریس تو کسی کو بھی معلوم نہیں۔ ڈیڈ الیاس کی وفات پر بھی سب لوگ قبرستان ہی آئے تھے۔

سینڈل ایک بار پھر روزن کے شیشے سے ٹکرایا تھا۔ ناکام۔

حیفہ مام کی سہیلیاں۔ ڈیڈ کے فرینڈز' ہمارے اٹارنی' آریز۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے لوگ نظر انداز کر دیں۔ ایک عورت کا اپنی جوان بیٹی کے ساتھ غائب ہو جانا۔ نہیں پولیس ضرور حرکت میں آئے گی اور جلد ہی یہاں پہنچ جائے گی۔

شیشے پر سینڈل کی ضرب نے دوبارہ بڑی گونج دار آواز پیدا کی تھی۔ دونوں نے ضد باندھ رکھی تھی۔ کوئی ٹوٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"اور اگر ان لوگوں نے بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کر دیا تو۔ نجانے ان لوگوں نے کہاں تک کی اور کب تک کی منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔"

پولیس کو حرکت میں لانے کے لیے کم از کم ہفتہ دس دن کا تو انتظار کیا ہی جاتا ہے۔ اور میں۔ میں یہاں سے نکلنے کی کوئی راہ جلد ہی نکال لوں گی۔ یقیناً" ان لوگوں نے اس چیز کا تصور نہیں کیا ہو گا۔ ان کا خیال ہو گا کہ یہ ہمیں بند کر دیں گے اور ہم بے بس اور لاچار ہو کر ان کی بات مان لیں گے۔ یہ سب منہ کے بل گریں گے۔"

سوچتے ہوئے بیانکا کی اپنی شکل کرخت ہو گئی تھی۔ وہ دیواریں نہیں توڑ سکتی تھی۔ کسی بھی قیمت پر۔ توڑ بھی سکتی تو کوئی فائدہ نہیں تھا۔ دیواروں کے پیچھے مٹی تھی۔ اور مٹی میں سرنگ کھودنے کا اسے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔

اس کا دایاں کندھا درد کرنے لگا تھا۔ سینڈل اس نے اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا جو دیوار کے ہی کسی حصے سے ٹکرا کر نیچے گر گیا۔

"خود کو مت ہلکان کرو بیانکا۔"

حیفہ مام نے رندھی ہوئی آواز میں کہا تھا۔یہ ٹھک ٹھک کل سے ساری رات ان کے دماغ پر بجتی رہی تھی۔

چاند تیرتا تیرتا کہیں بہت دور نکل گیا تھا۔اور سورج کی الوہی کرنوں نے روزن پر دستک دینی شروع کردی تھی۔

"اس کائنات میں کوئی ایک ایسا بھی ہے جو اس شیشے کے بنا ٹوٹے ہی ہماری پکار کو دنیا کی ساتویں تہہ سے بھی سن سکتا ہے۔وہ اللہ ہے۔تم بھی اللہ سے دعا کرو۔اب وہ ہی ہمیں اس مصیبت سے نکال سکتا ہے۔"

نیم اندھیرے میں اس نے پیچھے مڑ کر حیفہ مام کی طرف دیکھا تھا۔اور پھر پوری شدت سے سینڈل کھینچ کر شیشے پر دے مارا تھا۔کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی تھی۔اگرچہ یہ آواز کانچ ٹوٹنے کی آواز سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی تھی۔

لیکن اس کا دماغ اتنا حاضر ہی کب تھا جو اس بات پر غور کرتا۔مایوسی میں اس ننھی سی کامیابی نے بیانکا کا چہرہ تمتما دیا تھا۔کموڈ پر چڑھ کر روزن کی طرف جھانکتے ہوئے بے اختیار ہی اس کی نظر اپنے سینڈل پر گئی تھی۔سینڈل کو روزن کی روشنی کے آگے کرکے اس نے جانچا تھا۔

چمڑے کے نیچے کا مضبوط سول ٹوٹ چکا تھا۔وہ آواز ہیل ٹوٹنے کی ہی تھی۔ایک آنسو خود بخود ہی اس کے گال تک بہتا چلا گیا تھا۔

"تم ہاتھ ہلا کر باہر سے کسی کو متوجہ کرنے کی کوشش کرو بیانکا۔"

حیفہ مام نے اس کے کندھے پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھ کر اسے ایک اور راہ دکھائی تھی۔بیانکا نے اپنی دوسری آنکھ کا آنسو صاف کیا تھا۔

"بستر تہہ کرکے اس کموڈ پر رکھتے ہیں۔"

اس نے کہا تھا اور بستر تہہ کرکے وہ دونوں کموڈ پر رکھنے لگی تھیں۔

نئے کموڈ کے اوپر روئی دار بستروں کا ایک چھوٹا بے ڈھب سا ٹیلہ بن گیا تھا۔اب اگر وہ اس احتیاط سے چڑھتی کہ ایک بھی بستر نہ گرے تو وہ یقیناً روزن تک اپنا چہرہ لے جاسکتی تھی۔

"احتیاط سے چڑھو اس پر۔"

ساری احتیاطوں کے باوجود بھی بستر دوبار گرے تھے۔

لیکن تیسری بار بالآخر وہ شیشے کے قریب اپنا چہرہ لے جانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔روزن کی دیوار پر ہاتھ ڈال کر وہ اوپر اٹھی تھی۔حیفہ مام نے نیچے سے اسے ہر وہ سہارا دے رکھا تھا جو وہ اس عمر اور اس حالت میں دے سکتی تھیں۔

کافی لمحے اسی طرح بیت گئے۔لیکن بیانکا کچھ نہیں بولی تھی۔سورج کی دھوپ رفتہ رفتہ بڑھتی ہوئی پورے جوبن پر آگئی تھی۔

"کچھ ہے؟۔کوئی ہے باہر بیانکا۔"

حیفہ مام نے پرامید اور کسی قدر نرم آواز سے پوچھا تھا۔

بیانکا کا وجود کسی مجسمے کی طرح ساکت تھا۔

"بولو۔بیانکا!"

حیفہ مام نے اسے ٹانگوں سے جھنجھوڑا تھا۔مجسمہ بھربھری مٹی ثابت ہوا تھا۔حیفہ مام ایسا نہ کرتیں تب بھی بیانکا نے نیچے ہی گرنا تھا۔

اس تہہ خانے کا روزن گھر کے پچھلے حصے کی طرف تھا۔

شیشے کے پار دور دور تک بنا پھول والی سورج مکھی کی فصل بچھی ہوئی تھی۔اور وہاں کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ تھا۔

بیانکا کا دل چاہا کہ وہ اسی طرح گری رہے اور خوب جی بھر کے روئے۔اس نے ایسا ہی کیا۔وہ فرش پر پڑی رہی۔اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ وہ واقعی میں قید کردی گئی ہے۔

✡ ✡ ✡

برشگال کا دغاباز موسم اپنے عروج پر تھا۔ رات میں خوب بارش ہوئی تھی اور بھیگی چمنیاں رات بھر کالا دھواں اگلتی رہی تھیں۔ پھر صبح کھل کر دھوپ نکلی تھی۔

وہ آتش دان کے اوپر چوبی شیلف پر دھری مختلف چیزوں کو گھور رہا تھا۔

آتش دان کی کھا کے اندر رات کی جلتی لکڑیوں کی راکھ اور کوئلے کا ایک ڈھیر سا بن گیا تھا۔ قد آدم کھڑکی سے آتی ستمبر کی تیز دھوپ نے فرش پر ایک نئی کھڑکی کو گھڑ دیا تھا۔ اور اس نئی نوزائیدہ کھڑکی کا فریم رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے آتش دان میں پڑی لکڑیوں پر پڑنے لگا تھا۔

وقتی طور پر ادھ جلی لکڑیاں دوبارہ سلگی ہوئی دکھتی تھیں۔ اسے وہیں کھڑے کھڑے جیسے ایک صدی بیت گئی تھی۔

"یہ لو۔" آتے ہی سیرین نے انگوٹھی اور دو انچ کی لکڑی کا ٹکڑا (تعویذ) شہرام کے ہاتھ پر دے مارا تھا۔

"اب میرے گھر مت آنا۔ اب مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔" اس کی آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے۔

"یہ کیا ہے؟"

وہ ان دونوں چیزوں کو پہچانتا تھا۔ صرف سیرین کے ردعمل کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

"اختتام۔ ہر چیز کا۔ ہر تعلق کا۔"

"یہ اختتام اتنا بھیانک کیوں ہے؟" وہ اپنے ہاتھ میں موجود ان دونوں چیزوں کو دیکھنے لگا تھا۔

"تمہاری وجہ سے۔ تم میری ایک بات نہ مان سکے۔ دیکھو اب، ہم دوست بھی نہیں رہے۔"

"جب کوئی مرجاتا ہے تو بیٹھ کر اس کی لاش سے گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ ایک تعلق کو ختم کر کے تم دوسرے تعلق کی آس کیسے لگا سکتی ہو؟"

سیرین خاموش رہی تھی۔

"مجھے ایسا طریقہ بتاؤ سیرین! جس سے تم راضی ہو جاؤ۔ میری محبت تمہارے دل میں دوبارہ بھر جائے۔ تم پہلے والی سیرین بن جاؤ؟"

"خدا کے لیے بس کرو شہرام۔!" سیرین کی آواز سارے کمرے میں پھیل کر پلٹی تھی۔

"دیکھو میری محبت، میرا دل اب بھی ویسا ہی ہے۔ اس میں اب بھی تمہارے نام کی دھڑکن ہے۔ ابرچیر کی بارشیں بھی ہر بار ایک جیسی نہیں برستی ہوں گی، لیکن میں تمہارے ساتھ ویسا ہی رہوں گا۔"

"ان باتوں کا اب کوئی فائدہ نہیں شہرام۔"

"میں تمہارے لیے خود کو اذیت دینے پر بھی تیار ہو جاؤں گا اگر اس سے تمہاری خوشی منسوب ہوگی تو۔"

"میری خوشی۔ کیا یہ بات تمہارے لیے کافی نہیں ہے کہ میری خوشی اب تمہارے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔"

"کیا میری محبت اتنی بے مول اور کمزور تھی کہ تین سال کی جدائی اس پر اثر انداز ہوگئی۔"

"تم مجھ پر ہر طرح کا الزام دھر سکتے ہو شہرام، مگر اب ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں واپسی کے راستے کھو بیٹھی ہوں۔"

"تمہاری زندگی میں کوئی اور کیسے آگیا سیرین؟"

"مجھے بھی پتا نہیں چلا۔"

"اگر میں ایسا کرتا تو تمہیں کیسا لگتا؟"

"میں۔ میں تم سے کوئی سوال جواب نہ کرتی۔ تمہاری خوشی میں خوش ہو جاتی۔"

"یہ تجربہ بہت بھیانک ہے۔ تم اس لیے کہہ رہی ہو کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔"

"اور میں کر چکی ہوں۔ اور مجھے کوئی پچھتاوا بھی نہیں۔" اس کے انداز نے باغیانہ پن اختیار کر لیا تھا۔

شیلف کے اوپر لگی Aqim Suloi (البانی مصور) کی پینٹنگ "علی پاشا" کی نقل کو وہ گھورنے لگا تھا۔ تصویر میں جا بجا بکھرے مختلف رنگ لحہ بہ لحہ سمندری لہروں کی صورت اختیار کرتے جارہے تھے اور شہرام خود کو اس سمندری طوفان میں غرق ہوتا محسوس کر رہا تھا۔

"کیا نام ہے اس لڑکے کا؟" بڑی دیر بعد وہ گویا ہوا تھا۔

"وقت آنے پر تم جان جاؤ گے۔"

"کیا تم بھول گئی تھیں کہ تمہاری منگنی ہو چکی ہے۔ یا تم مجھے بھول گئی تھیں۔ میری محبت کو۔"

سیرین نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس سوال کا جواب دنیا کے کسی بے وفا کے پاس نہیں ہوتا' شہرام کو سیرین کی اس خاموشی نے طیش دلایا تھا۔

"بولو۔ جواب دو۔" اس نے سیرین کا بازو اپنے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں تھام لیا تھا۔

"چھوڑو مجھے شہرام۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔" وہ غصے سے تیز ہو کر بولی تھی۔

"ہاں' میں پاگل ہو گیا ہوں۔ اور میرے پاگل پن کی وجہ صرف تم ہو۔" شہرام نے اس کے بازو کو جھٹکے دیئے تھے۔

"سمجھو میں مر گئی ہوں۔"

شہرام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے وہ بولی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے یہ سب؟"

اماں زیتو یہ نجانے کہاں سے نمودار ہوئی تھیں۔ ان کے آگے جو منظر تھا' اسے دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ شہرام نے سیرین کا بازو چھوڑ دیا۔ سیرین نے وہاں رکنے میں ایک لمحے کو بھی گناہ جانا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلی تھی۔ جو کام وہ کرنے آئی تھی وہ ہو چکا تھا' پھر اب رکنے کا کوئی جواز بھی تو نہیں رہا تھا۔

اماں زیتو یہ' شہرام کی شکل دیکھنے لگی تھیں اور وہ چوبی شیلف پر دھری مختلف چیزوں کو۔۔۔ پھر اماں زیتو یہ جیسے نمودار ہوئی تھیں ویسے ہی غائب بھی ہو گئیں۔ یہ سوچتے ہوئے کہ یہ ان دونوں کا آپس کا مسئلہ ہے۔

"اگر یہ ایک دوجے سے بے تحاشا محبت کر سکتے ہیں تو لڑ بھی سکتے ہیں۔" وہ زیادہ دن تک اس غلط فہمی کی حقیقت سے انجان نہیں رہنے والی تھیں۔

شہرام وہیں کھڑا رہا تھا۔ دھوپ کھڑکی کا فریم بڑھتے بڑھتے شیلف کو جا لگا تھا۔ شہرام آج یہیں رات کر دینے والا تھا۔ شیلف پر دھری مختلف چیزیں دھوپ کی زد میں آنے لگی تھیں۔

شیشم کی لکڑی کا ایک گولڈن ایگل (البانی علامت) بابا ذلاری کے ہاتھ کا بنا ہوا جس کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ اطراف میں دو یونانی گلدان تھے۔ جو بنا پھولوں کے بھی بہت خوب صورت دکھتے تھے۔ اور چند خاندانی تصویروں کے فریم۔

ان ہی چیزوں کے درمیان ایک خنجر بھی پڑا ہوا تھا۔ پندرہویں صدی کے دور کا اور جس کا اسٹینڈ سنگ یشب کا تھا۔ شہرام نے شیلف سے وہ خنجر اٹھا لیا اور اسے میان میں سے نکال کر غور سے اس طرح دیکھا جیسے وہ آج کہیں اچانک سے اس گھر میں آ گیا ہو۔

کھڑے کھڑے فیصلہ کر لینے کے بعد شہرام نے اس خنجر کو اپنی نبض پر چلایا تھا۔ خنجر کی دھار تیز نہیں تھی۔ ایک سرخ لکیر اس کی کلائی پر بنی تھی جو فوراً" ہی معدوم بھی ہو گئی تھی۔ بددل اور مایوس سا ہو کر اس نے خنجر کو دوبارہ میان میں ڈالنا چاہا تھا۔

خنجر پرانا تھا یا میان کے اندر کوئی زنگ تھا۔ خنجر نے میان میں جانے سے جیسے انکار کر دیا تھا۔ وہ بڑی دیر اس کے ساتھ زور آزمائی کرتا رہا۔ پھر اسے سالوں پہلے سنی ایک روایتی بات یاد آئی تھی۔

"خنجر میان میں سے نکل تو اپنی مرضی سے آتا ہے۔ لیکن پھر یہ شب خون مارے بغیر واپس میان میں نہیں جاتا۔"

یہ بات یاد آتے ہی اس نے خنجر کو اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا تھا۔

آنکھوں میں کسی خوفناک ارادے کی پختگی لیے وہ وہاں سے باہر نکلتے ہوئے سوچنے لگا تھا کہ یہ خنجر "سان" پر تیز ہو گا یا "سلی" پر۔؟

☆ ☆ ☆

مالکوسی (رات کے راگ) میں بہا کے عیاں راز

دفن تھے۔ دور و نزدیک میں موجود ہلکی لرزشیں بھی بلند بانگ صدائیں بن گئی تھیں۔ پشت در پشت سے چلی آرہی زمین کے اندر لاکھوں کروڑوں کہانیاں حنوط تھیں۔ ظلم کی کہانیاں۔ ناانصافی کی داستانیں۔ ہوا میں گھوڑوں کے سموں اور تیر کے پیہم کی آواز تھی۔ اس نے کسی تیر سے بچنے کے لیے خود کو نہیں بچایا تھا۔ وہ بے خوف ہو چکی تھی اور پست بھی۔

وہ بستر پر چت لیٹی تھی۔ اور راکھ زدہ فرش پر پڑے لکڑی کے ریشوں سے کھیلنے میں مصروف تھی۔ وہ بھی بھوسے کو چن چن کر اکٹھا کرتی۔ کبھی انگلی سے گول دائرے بناتے بناتے انہیں دوبارہ بگاڑ کر رکھ دیتی۔

حیفہ مام کب سے اس کا یہ کھیل دیکھ رہی تھیں۔

پورا کمرہ باتھ روم کے تعفن سے بھرا ہوا تھا۔ بدبو کی نکاسی کے لیے سیڑھیوں کے ساتھ درز کے علاوہ اور کوئی درز نہیں تھی، بیانکا کی گھٹن رفتہ رفتہ بڑھتی جارہی تھی، لیکن وہ اپنے چہرے سے کسی طرح کا تاثر نہیں دے رہی تھی۔ حیفہ مام بھی بری طرح کھانسنے لگی تھیں۔ یہ کھانسی انہیں تہہ خانے میں دوسرے دن سے شروع ہوئی تھی اور آج چھٹا دن تھا۔ ان کی کھانسی اب انہیں لمحوں میں نڈھال کر دیتی تھی۔ اس کے باوجود ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے ہوئے بیانکا پر پھونکتی رہتی تھیں۔ انہیں بہت سے ورد یاد تھے۔ مصیبت سے نکالنے والے۔ مشکل دور کرنے والے۔

وہ ان وردوں کو پڑھنے کے علاوہ کچھ اور کر بھی نہیں سکتی تھیں۔ بیانکا نے بھی فرار کی ساری راہیں تلاش کرنا چھوڑ دی تھیں۔ ان کو بند کرنے کے لیے اس قدر منصوبہ بندی کی گئی تھی کہ اب باہر والوں کو کوئی جادوگر ہی ان ماں بیٹی کی اس تہہ خانے میں موجودگی کے بارے میں بتا سکتا تھا۔

"بیانکا اٹھو۔ کھانا اٹھاؤ وہاں سے۔" حیفہ مام نے بیانکا کو بلایا تھا۔ وہ کب سے ایسے ہی دونوں ہاتھ کھول کر بنا لحاف اوڑھے لیٹی تھی۔ حیفہ مام کا دل بند ہونے لگا تھا۔ ان دنوں کی تلخی اس کی ساری زندگی گہنا سکتی تھی۔

بیانکا نے سنا، لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی تھی۔

حیفہ مام کھانستے ہوئے خود ہی اپنے بستر سے باہر نکلی تھیں۔

ہر چیز کو بہت ترتیب سے چلایا جارہا تھا۔

کھانا رکھنے کے لیے بھی تہہ خانے کے دروازے کو پورا نہیں کھولا جاتا تھا۔ بلکہ نچلی تختی ہٹا کر کھانا سیڑھی کے پہلے زینے پر رکھ دیا جاتا تھا۔ کھانے کے لیے برتن بھی ڈسپوزیبل تھے تاکہ دھاتی یا کسی بھی طرح کے دوسرے برتنوں سے وہ کوئی کارروائی نہ کر سکیں۔

شروع کے دنوں میں بیانکا نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ لیکن یہ اذیت اپنے ہی خلاف جنگ کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھی اگر انہیں اس کی یا حیفہ مام کی ذرا سی بھی پروا ہوتی یا وہ ان دونوں کے لیے ترس، رحم کا جذبہ رکھتے تو نوبت یہاں تک آتی ہی نہ۔

لیکن ساری بازیاں ہار جانے کے باوجود بیانکا کھانے کو حرام تصور کر کے کھاتی تھی۔ احمد کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ وہ میڈیکل کا اسٹوڈنٹ ہے اور وہ ایسی دوائیوں کے بارے میں بھی جانتی تھی جس کے روزانہ کے استعمال سے انسانی اعصاب بالکل ست اور ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اکثر پولیس اور خفیہ انویسٹی گیشن والے ان ادویات کا استعمال قیدیوں پر کرتے ہیں۔ اور ان سے انہیں "یقیناً" کافی مدد ملتی ہے۔

بیانکا کو شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ ان کے کھانے میں بھی ایسی ہی دوائیاں شامل کی جاتی ہوں گی۔ تاکہ جلد ہی وہ ان کے آگے سرینڈر کر دیں یا وہ مزید مضبوط نہ رہ سکے۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)